مضامین برائے کلاس 12 بمطابق سلیبس

(ii) اتحادِ عالمِ اسلام

(iii) کرونا وائرس اور ہماری ذمہ داریاں

(iv) تعلیمِ نسواں

(v) والدین کا احترام

(vi) شجر کاری کی ضرورت و اہمیت

(vii) ماحولیاتی آلودگی: اسباب اور تدارک

(viii) بچپن ایک سنہری دور

(ix) کشمیر ہماری شہ رگ

(x) میرا نصب العین

(xi) اردو زبان: ضرورت و اہمیت

0306-7163117 محمد سلمان سلیم
0343-7008883 پاکستان زندہ باد
0333-8033313 راؤ ایاز

اتحاد عالم اسلام مضمون

اتحاد عالم اسلام بارھویں جماعت کے smart syllabus کا بہت اہم مضمون ہے اس مضمون کو کئی عنوانات کے تحت امتحان میں پوچھا جا سکتا ہے مثلاً اتحاد کا مفہوم، پاکستان اور عالم اسلام، ملی وحدت مضمون، امت کا تصور، مظلوم امت مسلمہ اور اقوام عالم، اتحاد امت وقت کی ضرورت شامل ہیں۔اس کے علاوہ مندرجہ ذیل عنوانات بھی آپ کے ذہن مین ہونے چاہیے۔

- قومی یکجہتی
- اتحاد عالم اسلام وقت کی ضرورت
- اتحاد امت کی اہمیت
- اتحاد امت وقت کی ضرورت
- اتحاد امت مسلمہ
- قومی اتحاد پر مضمون
- اتحاد بین المسلمین
- اتحادِ عالم اسلام
- ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
- ملت اسلام کا اتحاد، اخوت، قومی اتحاد
- ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
- پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ
- اسلامی اخوت
- اسلامی بھائی چارہ
- وحدت ملی اور ہماری ذمہ داریاں
-

- اتحاد عالم اسلام

اتحاد بین المسلمین

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اتحاد عالم اسلام کا مفہوم بہت آسان اور واضح ہے اتحاد عالمِ اسلام کا مطلب مختلف مسلمان ممالک یا فرقوں کا باہمی تعاون کرنا اور آپس میں ٹکراؤ اور تنازعے سے گریز کرنا اور مسلم امت کے مسائل کو مل کر حل کرنا ہے ۔ اسی کو اتحاد بین المسلمین بھی کہا جاتا ہے مزید برآں یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کی نفی نہ کریں۔اپنی طاقت اور سرمائے کو کسی دوسرے اسلامی مملکت کے خلاف استعمال نہ کریں۔

ملتِ اسلامیہ عظیم ثقافت اور شاندار میراث کی حامل تھی اس کے ساتھ باہمی اخوت کے جذبے سے سرشار تھی اس میں تنوع اور رنگارنگی کے باوجود بڑی حیرت انگیز یکسانیت اور یگانگت پائی جاتی تھی ۔پوری دنیا میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

اور آج ستاون اسلامی ممالک ہیں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب ستاون کروڑ افراد پر مشتمل ہے اس حساب سے دنیا کا ہر چوتھا شخص مسلمان ہے۔عیسائیت کے بعد اسلام دوسرا بڑا مذہب ہے ۔ملت اسلامیہ کے اکثر ممالک کا شمار دنیا کے امیر ترین ممالک میں ہوتا ہے ۔ اللہ تعالی نے اسلامی ممالک کو عظیم قدرتی دولت اور وسائل سے نوازا ہے ۔اسلامی ممالک کے پاس ایٹمی طاقت کے ساتھ ساتھ دنیا کی بہترین افواج بھی موجود ہیں ۔ وسیع و

عریض سمندر، سونا ، چاندی ، تیل،یورینیم اور بے شمار معدنیات کے ذخائر ہیں، دریا اور زرخیز زمین موجود ہے۔ لیکن پھر بھی دنیا میں ذلیل و خوار ہورہے ہیں۔ذلالت سے بچنے کا ایک ہی حل ہے بقول اقبالؒ

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ

پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ!

آج کے کشمیری مسلمان ہندوؤں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں تو بدھسٹوں نے سری لنکا اور برما میں مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا ہے ۔ یہودیوں نے مقبوضہ فلسطین میں اور عیسائیوں نے افغانستان، لیبیا، شام، عراق کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا ہے عالمِ کفر جگہ جگہ مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رہا ہے یہ تباہی ہمارے شامتِ اعمال کی وجہ سے ہے کیونکہ ہم نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور تفرقے میں پڑ گئے ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

ترجمہ : اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو

اب وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان اللہ سے تجدیدِ عہد کریں اور اتفاق و اتحاد کا عملی مظاہرہ کریں ۔پورے عالمِ اسلام کو ایک زنجیراور تسبیح کی مانند جوڑا جائے تاکہ ہم اپنی سنہری تاریخ کو دہرانے کے لیے تیار ہو جائیں ۔کیونکہ مسلمان ایک عالم گیر برادری ہیں جن کے تمام مسائل و معاملات ایک دوسرے کے تعاون سے ہی حل ہوسکتے ہیں ۔ ان کے اندر اتحاد ، نظم و ضبط اور تنظیم سازی وقت کی پکار ہے۔ جہاں پہلے ہی لالچ ، خودغرضی اور سستی ہو، وہاں اتحادو یگانگت کو کیسے فروغ دیا جا سکتا ہے ۔اقبالؒ ستاروں کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے

پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اسلامی اتحاد و یکجہتی کی بنیادی اکائی توحید ہے اس کے بعد قرآن کریم بھی مسلمانوں میں اتحاد کا ذریعہ ہے ۔ امت مسلمہ کے اتحاد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں اتحاد کے بارے میں تقریباً 50 آیات کا تذکرہ ملتا ہے قرآنِ مجید بار بار مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت کی اہمیت کے بارے میں بتاتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی سب مسلمانوں کو بھائی قرار دیا ہے:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ

ترجمہ: "بے شک مُسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔

اگر مسلمانوں نے آج اتحادو یکجہتی کو گنوا دیا تو وہ تشخص کے ساتھ ساتھ عزت وآبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنا بہت ضروری ہے بقول اقبالؒ

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اسلامی اتحاد و یکجہتی کو انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح پر قائم کرنا ملّتِ اسلامیہ کا فرض ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک اقامتِ دینِ اسلام کا کام دنیا میں ہوتا رہا، ملِت اسلامیہ ایک عظیم طاقت اور حکمران کی حیثیت سے دنیا پر غالب رہی اور جیسے ہی مسلمانوں کی ترجیحات بدل گئیں، ان کی دلچسپیاں انفرادی جزئیات کو فروغ دینے کی طرف ہوئیں تو ان میں اجتماعیت اور اتحاد و یگانگت کا فقدان ہو گیا اور مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ جس کی وجہ سے غلامی ان کا مقدر ٹھہری ۔ گروہ بندی اور تفرقہ بندی کے متعلق اقبالؒ فرماتے ہیں:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک

کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

ملّتِ اسلامیہ نے جب بھی تفرقہ سے بالاتر ہوکر اتحاد و یگانگت کا شاندار مظاہرہ کیا، تو ان کا طوطی پورے زمانے میں بولا ۔اس کی ایک بڑی مثال برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی ہے جب انھوں نے قومی اتحاد اور یک جہتی کا ثبوت دیا تو دنیا کے نقشے میں ایک عظیم مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے وجود میں آئی۔ یہ سب کچھ اللہ کے فضل و کرم اور مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور جاں نثاری کی بدولت ہوا۔ آج بھی ہمیں اسی یگانگت کی ضرورت ہے۔بقول اقبالؒ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

مسلمانوں کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی ذاتِ اقدس تاریخ بشریت کی عظیم ہستی اور اتحاد کا ایک اہم نقطہ ہے ۔قرآن و حدیث سے جو اصول و قوانین ہمیں ملے ہیں ان کی بدولت ہی یہ اجتماعیت اور اتحاد قائم رہ سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے

"دشمنوں کے لئے مسلمان سارے ایک مٹھی ہیں"

ایک اور حدیثِ مبارکہ ہے:

"تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں اگر جسم کا ایک حصہ درد کرتا ہے تو سارا بدن اس حصے کی مدد کرتا ہے تاکہ اس کا درد برطرف ہو جائے۔

علامہ اقبالؒ اپنے کلام میں اتحاد و یگانگت کے متعلق کہتے ہیں:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو

اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے

تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پُر فشاں ہو جا

اتحادِ عالم اسلام کے سب سے بڑے داعی اقبالؒ تھے انھوں نے ملت اسلامیہ کو اتحاد کا درس دیا اور مغرب اور مغربی تہذیب سے دوری اپنائے رکھنے کے لیے کہا۔

اپنی ملت پہ قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

علامہ اقبال ؒ مذہب کو ملت کے اتحاد کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اقبال ذات اور نسل پرستی کی قید سے بالاتر ہیں اقبال کے اشعار میں ہمیں ہمیشہ مسلمانوں کی باہمی یگانگت اور اتحاد کا درس ملتا ہے۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں۔

مسلمانوں میں تفرقہ بندی اور انتشار کے اہم اسباب:

1. قرآن وسنت پر عمل پیرا نہ ہونا
2. شرک کا شکار ہونا
3. جہالت اور کم عقلی
4. نسلی تعصب اور فرقہ بندی
5. صاحبان اقتدار کی اسلام سے دوری
6. مسلمانوں کے مفادات سے علمائے اسلام کی لا تعلقی
7. اغیار سے امیدیں
8. جعلی مسلک کا فروغ
9. مقدس مقامات کی پامالی اور توہین

10. قوم پرستی جیسے اختلافات

ملت اسلامیہ کے اتحاد مخالف بعض عوامل کی بات کی جائے اس میں سب سے پہلے مسلم اقوام کے اختلافات اس کے بعد مذہبی اختلافات شامل ہیں مسلکی، فرقہ وارانہ اور سیاسی اختلافات کا موجود ہونا بھی تفرقہ بندی کی بنیاد ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے ان اختلافات کو ختم کرنا پڑے گا۔ تاکہ ان کی آڑ میں اسلام دشمن طاقتیں اپنی دائمی سازشوں کے تحت مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو ہوا نہ دے سکیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمام اسلامی ممالک اور فرقوں کے اہل نظر حضرات مسلمانوں کے درمیان فتنہ کی آگ پھیلنے اور باہمی بھائی چارے اور محبت و الفت کو مٹنے نہ دیں جو دشمنان اسلام کی اولین کوشش ہے۔ آج مسلمانوں کے سارے مسائل کا حل ان کی اجتماعیت اور اتحاد ہے،وہ متحد نہیں اس لئے ان کی شریعت بھی محفوظ نہیں ہے۔

اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستان کا ہر پیرو جواں بیتاب ہو جائے

قرآن و حديث کي روسے اتحاد عالم اسلام اور امن و يگانگت کي ضرورت

تحرير:ڈاکٹر محمد کامل (ايران)

دورِ حاضر ميں اسلامي امت کي سب سے بڑي بلا و مصيبت بعض مسلمانوں کا بعض مسلمانوں کو کافر قرار دينا يا ان کي تکفير ہے يہ مصيبت فرقوں ميں اختلافات اور نظريات کے الگ ہونے اور اسلام کے مفاہيم کا غلط معني کرنے نيز بے جا تعصب کي بنا پر وجود ميں آئي ہے ۔

اس مضمون ميں قرآني آيات و احاديث اور علماء کے نظريات سے استفادہ کر کے ثابت کيا گيا ہے کہ مسلمان کي تکفير جائز نہيں ہے اور مسلمانوں کو اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر کے اسلامي ثقافت کو رائج کرنے ميں کہ جس ميں دوسروں کے احترام پر تاکيد کي گئي ہے اور اتحاد قائم کرنے ميں کردار ادا کرنا چاہيے ۔

بہت سي قرآني آيات اور احاديث ميں انسان کو رحمت ،وحدت اور اسلامي و انساني اخوت ،انصاف ،اور حصول علم کي طرف دعوت دي گئي ہے ان امور کو اسلامي معاشرے کي تعمير کے ل ئے ضروري قرار ديا گيا ہے۔

سورۃ احزاب کے آغاز ميں ديني، اجتماعي، سياسي، اور اخلاقي لحاظ سے دوگانگي يا دورخي رويے کي نفي کي گئي ہے ارشاد ہوتا ہے ماجعل اللہ لرجل من قلبين في جوفہ اللہ نے کسي آدمي کے سينے ميں دو دل پيدا نہيں ک ئے يعني خدا نے انسان کو بيک وقت دو طرح سے سوچنے کي صلاحيت نہيں دي ہے تاکہ وہ دوگانگي کا شکار ہو جائے۔ اس سورہ ميں مسلمان کو ايک پاک باز آلائشوں سے پاک اور عہد و پيمان پر باقي رہنے والا انسان قرار ديا گيا ہے جس کا دين و ايمان مشکلات ميں مزيد مستحکم ہو

جاتا ہے-

ہمیں اس سورہ میں رسول اسلام صلي اللہ وعليہ وآلہ وسلم کي پيروي کرنے کا حکم ديا گيا ہے ۔

اسلام کي ان اعلي وارفع تعليمات کے باوجود اسلامي ملکوں ميں جھل، غربت اور نفرت کا منحوس مثلث ديکھنے کو ملتا ہے اسي طرح سے مسلم ملکوں ميں ظلم ،عدم مساوات، طبقاتي فاصلے، اور اسلامي اور انساني ذمہ داريوں کي طرف سے لاپرواہي ديکھي جا سکتي ہے جس کي وجہ سے ان ملکوں ميں اکثريت کي زندگي درھم برھم ہوکر رہ گئي ہے-

اسلامي امة ميں تفرقہ اور تشتت کا سب سے بڑا سبب ايک دوسرے کي تکفير کرنا ہے ہميں قرآني آيات احاديث اور اجتھادات اور ايسے لوگوں کي آرا جو امت کو اتحاد کي طرف بلاتے ہيں ان سے استفادہ کرکے اس بيماري کا علاج تلاش کرنا ہوگا اس طرح سے ہم ايک طرف تو اتحاد کے نظريات کو رائج کريں گے اور دوسري طرف سے بے جا تعصب اور انتہا پسندي پر مبني نظريات کا ازالہ کرنے ميں کامياب ہوجائيں گے جن سے اسلام کي بدنامي ہو رہي ہے

اس سلسلے ميں قرآني آيات اور احاديث اور ان کا مفہوم پيش کرنے سے پہلے جو امت کو بيدار کرنے ميں بنيادي اہميت رکھتي ہيں ميں بعض علماء اور اسلامي تحريکوں اور عوام کے درميان عدم اتحاد و انسجام کي طرف اشارہ کرنا چاھتا ہوں-

عالم اسلام کے بزرگ علماء عام طور سے اتحاد پر زور دے رہے ہيں ايسے عالم ميں کچھ ايسے عناصر بھي پائے جاتے ہيں جو الگ ذھنيت کے مالک ہيں اور مذھبي اختلافات و بعض آداب ورسوم کي بنا پر مسلمانوں کو کافر قرار ديتے ہيں-يہي نہيں بلکہ انہيں واجب القتل بھي قرار ديديتے ہيں-

جبکہ اسلام میں انسان كي جان اور اس کے تحفظ پر تاکید كي گئي ہے ارشاد خداوندي ہے کہ

من قتل نفسا بغير نفس اور فساد في الارض فكانما قتل الناس جميعا)سورة مائده 32(
جو شخص كسي کو نہ جان کے بدلے میں نہ ملک میں فساد پھیلانے كي سزامیں (بلکہ ناحق) قتل کردے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

اسي طرح سورہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے کہ
وماکان لمومن ان یقتل مومنا الآّخطاء كسي ایمان دار کے ل ئے یہ جائز نہیں کہ كسي مومن کو جان سے مار ڈالے مگر غلطي سے (ایسا ہوجائے) ۔

اس كي ایک آیت کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ
ومن يقتل مومنا متعمدا فجزاوہ جهنم خالدا فيها و غضب الله عليه و لعنه و اعدله عذابا عظيما
اور جو شخص كسي مومن کو جان بوجھ کے مار ڈالے تو اس كي سزا دوزخ ہے اور ہمیشہ اس میں رہے گا اس پر خدا نے اپنا غضب ڈھایا ہے اور اس پر لعنت كي ہے اور اس کے ل ئے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے ۔

یہاں پر واضح ہے کہ قرآن نے مسلمان کے ل ئے مومن كي تعبیر استعمال كي ہے جبکہ سورہ حجرات میں فرماتا ہے کہ
قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا و لکن قولوا اسلمنا
بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ اسلام لے آئے ۔

اس آیۃ سے پتہ چلتاہے کہ اسلام میں تمام مسلمان شامل ہیں اور ان کے دل کا حال خدا جانتا ہے

اور وہي ان کے ایمان کي حقیقت سے بھي واقف ہے اور ان کے ایمان کا حساب روز قیامت کیا جائے گا ان آیات شریفہ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسي مسلمان کو کافر قرار دینا اور اس کے قتل کا حکم دینا جائز نہیں ہے اور یہ امر خود ایک طرح سے اتحاد و یکجھتي کي دعوت دینا ہے ۔

امت اسلامي اور دیگر اہل کتاب اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ شریعت کا مقصد ضروریات یعني دین، جان، مال، نسل و عقل کي حفاظت ہے، ان کا کہنا ہے کہ انساني جان کے تحفظ پر اس قدر تاکید کي گئي ہے کہ قتل نفس پر قصاص رکھا گیا ہے اور عذاب خدا سے ڈرایا گیا ہے یہي نہیں بلکہ قتل نفس گناہان کبیرہ میں شامل ہے جو شرک سے بہت نزدیک ہے جس طرح سے کہ نماز ایمان سے قریب تر ہے ۔

سٹیلائٹ ٹي وي چینلوں کا شاید یہ ایک مثبت پہلو ہو کہ وہ تنگ نظر افراد کے نقطۂ نظر کو بھي بیان کرتے ہیں، کچھ لوگوں نے سوال کیا تھا کہ وہ ملت عراق کي مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن اس وجہ سے وہ مدد نہیں بھیج رہے ہیں کہ انہیں خوف ہے کہ ان کي بھیجي ہوئي مدد کہیں دیگر مسلک اور فرقے کے لوگوں کو نہ مل جائے اس طرح کي سوچ ترجیحات کي نفي اور اتحاد کي مخالف ہے اس طرح کے دورخي رویے ہمیں خوارج کي یاد دلاتے ہیں جنہوں نے رسول اسلام (ص) کے گرانقدر صحابي خباب بن ارت (رض) کو قتل کیا اور ان کي حاملہ زوجہ کا پیٹ چاک کرکے انہیں بھي قتل کردیا لیکن ایک یہودي کو جب تک اس کے خرموں کي قیمت نہ دیدي خرمے نہیں کھائے (یہ تنگ نظري اور شدت پسندي نہیں تو اور کیا ہے)

سورۂ احزاب میں خاص طور سے دودلي اور دورخي کي بات کي گئي ہے جس کا سرچشمہ نفاق ہے یہ نفاق مدینہ میں بھي اس وقت دیکھنے کو ملا تھا جب کفار نے مدینے کا محاصرہ کرلیا تھا، منافقین کے دل میں کفر ہوتا ہے اور وہ صرف ظاہري طور پر اسلام کي بات کرتے ہیں قرآن میں منافقون نام کی ایک سورہ بھي ہے اس سورہ میں خدا نے انہیں دروغ گوئي کفر اور دشمني کي صفتوں کا حامل قرار

دیا ہے اس کے بعد رسول اکرم سے مخاطب ہوکر ارشاد فرماتا ہے کہ

سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفراللہ لھم

تم ان کے ل ئے مغفرت کي دعا مانگو یا نہ مانگو ان کے حق میں برابر ہے خدا تو انہیں ہر گز بخشے گا نہیں۔

سورہ نساء میں بھي ارشاد ہوتا ہے کہ

ان المنافقین في الدرک الاسفل من النار

بے شک منافقین کي جگہ جھنم کے آخري طبقے میں ہے۔

ان تمام امور کے پیش نظر اور جب کہ حضرت جبرائیل نے رسول اسلام (ص) کو منافقین کے ناموں سے آگاہ کر دیا تھا اور مسلمانوں کو مدینے میں کافي طاقت بھي حاصل ہو چکي تھي لیکن رسول اسلام (ص) منافقین سے ان کي ظاہري حالت کے مطابق ہي پیش آتے تھے یعني مسلمانوں کي طرح ہي پیش آتے تھے کیونکہ انہوں نے خواہ ظاہري طور پر ہي کیوں نہ ہو کلمہ شہادتین جاري کیا تھا رسول اسلام (ص) نے ان کے باطن کا حساب خدا کے حوالے کر دیا تھا، یہاں ہم خود سے سوال کرسکتے ہیں کہ کیا ہمیں امت میں ترجیحات کے مطابق عمل نہیں کرنا چاہیے ؟

کیا ہمیں اس سلسلے میں بھي رسول اسلام (ص) کي سنت کي پیروي نہیں کرنا چاہیے رسول (ص) کي اس سیرت کے پیش نظر کیا ہم دوسرے فرقوں کے مسلمان بھائیوں کو منافق قرار دے سکتے ہیں؟ سیرت رسول (ص) تو یہي بتاتي ہے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کرسکتے۔

رسول اسلام (ص) کي حدیث شریف کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بھي کلمہ لا الہ الا اللہ کو اپني زبان پر جاري کر لے اس کے قتل کا حکم نہیں دیا جاسکتا صحیح مسلم میں یہ حدیث دیکھي جاسکتي

ہے کہ سمعت اسامۃ بن زید بن حارثۃیحدث قال بعثنا رسول اللہ (ص) الي الحرقہ من جھنیۃ فصبحنا القوم فھزمناھم ، قال ولحقت انا ورجل من الانصار رجلا منھم فلماغشیناہ قال لا الہ الا اللہ قال فکف عنہ الانصاري وطعنتہ برمحي حتي قتلتہ قال فلما قدمنا بلغ ذلک النبي فقال لي یا اسامۃ اء قتلتہ بعد ما قال لا الہ الا اللہ ؟ قال فمازال یکررھا علي حتي تمنیت اني لم اکن اسلمت قبل ذلک الیوم۔

اسامۃ بن حارثہ سے میں نے سنا کہ انہوں نے کہا ایک دن رسول اسلام (ص) نے ہمیں جھنیہ قبیلے کے حرقہ طائفہ کي طرف روانہ فرمایا علي الصباح ہم لوگ وہاں پہنچ گ ئے اور نہیں شکست دیدي اسامۃ کہتے ہیں میں نے اور ایک انصاري نے حرقہ کے ایک شخص کو جالیا جب اسے زمین پر گرا کر نزدیک تھا کہ قتل کر دیں تو اس نے کہالا الہ الا اللہ انصاري نے فورا اپني تلوار ہٹالي لیکن میں نے اسے نیزہ سے مار کر قتل کر دیا، اسامۃ کہتے ہیں اس کے بعد ہم لوگ مدینے لوٹ آئے رسول اسلام (ص) کو یہ خبر پہنچ چکي تھي آپ نے مجھ سے فرمایااے اسامۃ کیاتم نے اس شخص کو لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھي مار ڈالا ؟ اسامۃ کہتے ہیں کہ رسول اسلام (ص) بار بار اس جملے کي تکرار فرماتے رہے اور میں دل میں خود کو کوستا رہا کہ کاش اس دن سے قبل مسلمان نہ ہوا ہوتا۔

ایک اور روایت میں ہے فکیف تصنع ب لا الہ الا اللہ اذا جاءت یوم القیامۃ۔اگر روز قیامت لا الہ الا اللہ تمہارا دامن تھام لے تو کیا کرو گے ؟

اس حدیث شریف سے پتہ چلتاہے کہ وہ مشرک جس نے کئي مسلمانوں کو قتل کیاہے اگر وہ بھي اپني زبان پر کلمہ توحید لا الہ الا اللہ جاري کر لیتاہے تو رسول اسلام (ص) کے نزدیک اس کا قتل صحیح نہیں ہے اور اگر اسامۃ کي آرزو کو دیکھیں جو انہوں نے کہا تھا کہ اے کاش میں اس دن سے قبل مسلمان نہ ہوا ہوتا تو اس سے پتہ چلتاہے کہ اسلام جاھلیت کے دور کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے لھذا معلوم ہوا کہ مسلمان کي تکفیر اور اسے قتل کرنا گناہ عظیم ہے ۔

جب حضرت عمر ابن خطاب (رض) زخمي ہوگ ئے تھے اور موت کے قريب تھے تو ابن عباس (رض) نے ان سے کہا کہ مدينے کے پست اور سرکش لوگوں کو قتل کر دو

تو انہوں نے کہا کہ رسول اسلام (ص) نے فرمايا ہے کہ انما الاعمال باالنيات و انما لکل امرء ما نوي اعمال کا انحصار نيت پر ہے اور انسان کو وہي ملے گا جو اس کي نيت ہو ۔

سورہ عاديات ميں ارشاد ہوتا ہے کہ افلا يعلم اذا بعثر ما في القبور و حصل ما في الصدور کيا انسان يہ نہيں جانتا کہ جب مردے قبروں سے نکالے جائيں گے اور دلوں کے بھيد ظاہر کر دئے جائيں گے-

يہ آيت و حديث اعمال کو نيت پر تولتي ہے اور نيت سے سوائے خدا کے کوئي واقف نہيں ہوتا لھذا ہم ظاہري حالت کو نظر انداز کر کے کسي مسلمان پر کفر اور اس کے قتل کا حکم جاري نہيں کر سکتے۔

ہمارے مدعا کي تائيد فتح مکہ کے دن رسول اسلام (ص) کي سيرت سے بھي ہوتي ہے مکہ فتح کرنے کے بعد آپ (ص) نے مشرکين سے فرمايا کہ اذھبوا انتم الطلقاء

جاؤ تم سب آزاد شدہ ہو آپ (ص) نے انہيں قتل کرنے کي ممانعت کي اور ان سے يہ مطالبہ نہيں کيا کہ فورا مسلمان ہو جائيں، اس کے علاوہ تاريخ ہميں بتاتي ہے کہ رسول اسلام (ص) نے جنگ حنين کے بعد مشرکين ميں جنگي غنائم تقسيم ک ئے تا کہ وہ اسلام کي طرف راغب ہوں ۔

سورہ نساء ميں خدا فرماتا ہے کہ ان اللہ لا يغفر ان يشرک بہ و يغفر ما دون ذلک لمن يشاء خدا البتہ اس جرم کو تو نہيں معاف کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کيا جائے ہاں اس کے سوا جو گناہ ہو جسکو چاہے معاف کر دے، اس آيت مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسي مسلمان پر کفر و قتل کا حکم کيسے لگايا جا

سکتا ہے جبکہ یہ امکان موجود ہے کہ خدا نے اسے معاف کر دے یا معاف کردیا ہو ۔

اس کے علاوہ ایک اور سوال در پیش ہے وہ یہ کہ بعض لوگ کس طرح سے ان مسلمانوں کے کفر وشرک کا فتوي جاري کر دیتے ہیں جو کلمہ شہادتین جاري کرتے ہیں نماز پڑھتے ہیں حج کرتے ہیں ،روزہ رکھتے ہیں ،کیا صرف و صرف اس ل ئے کہ وہ ان ھم مسلک اور ھم رائے نہیں ہیں ؟

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اسلام خدا کي وحدانیت اور رسول اللہ (ص) کي نبوت کا اقرار کرنا ہے ان شہادتوں سے جانوں کي حفاظت ہوتي ہے ۔

ابوالحسن اشعري نے بھي کہا ہے کہ وہ اھل قبلہ میں سے جو بھي شہادتیں جاري کرلے اسے کافر نہیں قرار دے سکتے ۔

الوافقات میں لکھا ہے کہ منحرف گروہ گمراہي کے سبب دین سے خارج نہیں ہوتے کیونکہ رسول اسلام (ص) نے ایسے گروہوں کے بارے میں فرمایا ہے تفترق امتي یعني آپ (ص) نے یہ فرماکر کہ میري امت متفرق ہو جائے گي ان گروہوں کو اپني امت سے نسبت دي ہے جبکہ اگر یہ گروہ اپني بدعتوں کي بناپر دین سے خارج ہوتے تو انہیں امت سے نسبت نہ دي جاتي،اسي طرح اھل بدعت کو کافر قرار دینے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے اس کي وجہ یہ ہے کہ نصوص شرعیہ میں اھل بدعت کے دین سے خارج ہونے کے سلسلے میں کوئي دلیل نہیں ہے اور اصل یہ ہے کہ وہ دین کے دائرے میں ہیں مگر یہ کہ کسي دلیل سے اس کے برخلاف ثابت ہوتا ہو۔

اس مضمون میں جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا وہ ان متون و نصوص کا ایک چھوٹا سانمونہ تھا جو مسلمانوں کي تکفیر و قتل کو حرام قرار دیتي ہیں اور اگر علماء و دانشوروں کے علاوہ بھي معاشرے کے دوسرے طبقے ذرایع ابلاغ عامۃ سے علماء کے فتووں سے آگاہي حاصل کریں اور ہمارے علماء و

دانشور اپنے قلم وزبان سے سنت نبوي (ص) کا دفاع کریں اور اتحاد اسلامي کے کوششیں کریں تو معاشرے میں نئي فکر رائج ہو گي اور وہ فکر ایک دوسرے کا احترام کرنے نیز ایک دوسرے کي بات سننے کي ہو گي اس طرح ہم آزادي فکر و بیان اور گفتگو کے ساز گار ماحول میں قدم رکھیں گے اور نتیجہ میں ہماري امت کے درمیان تعاون و مفاھمت بڑھتي جائے گي اور آخر کار ہم ایک امت واحدہ بن جائیں گے ۔

ڈاکٹر محمد کامل

مسلمانوں کا آپسی اتحاد: وقت کی اہم ضرورت شاہ مدثر، عمر کھیڑ editor اکتوبر 23, 2019 0

FacebookTwitterGoogle+LinkedInStumbleUponTumblrPinterestRed ditVKontakteOdnoklassnikiPocketمسلمانوں کا آپسی اتحاد: وقت کی اہم ضرورت شاہ مدثر، عمر کھیڑ (ایڈیٹر افکارِ نو) اسلام نے مسلمانوں کے سامنے آپسی اتحاد و اتفاق اور اجتماعیت کا مثبت تصور پیش کیا ہے اور مسلمانوں کے مضبوط تعلقات پر خاص زور دیا ہے۔ آج عالمی سطح پر دعوتِ دین اور غلبہ دین کے لئے امت مسلمہ میں مضبوط اجتماعیت اور منظم اتحاد کی ضرورت ہے۔ قرآن و سنت میں متعدد مقامات پر اجتماعیت اور آپسی اتحاد پر صاف صاف وضاحتیں ملتی ہیں۔ سورہ العمران آیت 103 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور آپس میں تفرقہ بازی نہ کرو۔ یہاں مفسرین کے نزدیک ”حبل اللہ“ سے مراد کتاب اللہ اور سنت رسول ہے۔ اسی طرح سورہ انفال آیت 46 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اَطِیۡ عُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡ لَہٗ وَ لَا تَنَازَعُوۡ اقتَفۡ شَلُوۡ اوَ تَذۡ ہَبَ رِیۡ حُکُمۡ وَ اصۡبِرُوۡ ا ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡ نَ. "یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑا و اختلاف نہ کرو، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو یقینا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ اللہ کے رسول ﷺ نے حجتہ الوداع کے موقع پر اپنے تمام صحابہ کرام کے سامنے فرمایا ”تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ“ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں جب تک ان دونوں چیزوں کو تم مضبوطی سے پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ کتاب اللہ اور رسول کی سنت ہے۔ (مسلم) لہذا مسلمانوں کے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول کی شکل میں اتحاد و اتفاق کی دو مضبوط بنیادیں موجود ہیں۔ ایک مصرعہ ہم نے اکثر سنا ہو گا "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے“ یہ مصرعہ مشہور شاعر مرحوم علامہ اقبال کا ہے، علامہ اقبال نے بھی اُمت اسلامیہ کو ہمہ گیر سطح پر جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مسلمانوں کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتے رہیں کہ قومیت کے بتوں کو توڑ کر ایک ملّت کی شکل میں متحد ہو جائیں۔ کیونکہ یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے ایک زندہ قوم کی حیثیت سے ہم اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ لیکن مقام صد افسوس ہے کہ آج اس دین کے پیروکار ہی دنیا میں سب سے زیادہ گمراہ اور بھٹکی ہوئی راہ پر گامزن ہے۔ ذلت و رسوائی اور ذہنی محکومی ہمارا مقدر ثابت ہورہی ہے۔ آج دشمنانِ

اسلام عالمی سطح پر ملت کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ فلسطینی مسلمانوں پر عرصہ دراز سے ظلم وزیادتی کا سلسلہ شروع ہے۔ عالم اسلام کے بے شمار قائدین کو پابند سلاسل کر دیا گیا ہے اور بہت سی شخصیتیں شہید کر دی گئیں ہیں۔ اسی طرح اب ہندوستانی مسلمانوں پر بھی خوف کے کچھ بادل منڈلانا شروع ہو چکے ہیں۔ یکساں سیول کوڈ کے نفاذ کی کوشیش جاری ہیں۔ جس کے لئے مختلف قانون وضع کئے جا رہے ہیں۔ اس ملک کی یہ تاریخ رہی ہے کہ یہاں کے اکثر بے قصور مسلم نوجوانوں کو دہشت گرد ثابت کر کے ان کے مستقبل کو برباد کیا جاتا رہا۔ انہیں جیلوں کے اندر طرح طرح کی اذیتوں سے گزارا گیا۔ اور اب براہِ راست تمام ہندوستانی مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ حکومت کی جانب سے این آر سی کے نام پر مسلمانوں کے اندر خوف وہراس کا ماحول پیدا کیا جارہا ہے۔ اسی طرح ماب لینچنگ کے ذریعے مسلمانوں کی نسل کشی ایک منظم پروپگنڈے کا حصّہ ہے۔ خیال رہے کہ اس وقت ملک کی جو موجودہ حکومت ہے وہ فسطائیت پر کھڑی ہوئی ہے۔۔ ایسے نازک ترین حالات میں ملت اسلامیہ کے اندر آپسی اتحاد وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آپسی اتحاد واتفاق کی کوششوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ یقین بھی رکھنا چاہیے کہ دین اسلام ہی حقیقی دین ہے۔ یہ کبھی ختم ہو ہی نہیں سکتا خواہ باطل طاقتیں کتنا ہی زور کیوں نہ لگالیں۔ آج ہمیں اسی یقیں محکم کے ساتھ مسلمانوں کے اندر آپسی اتحاد واتفاق کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ آج ملتِ اسلامیہ اپنی تاریخ کے انتہائی نازک ترین دَور سے گزر رہی ہے۔ باطل طاقتیں اپنے پورے وسائل کے ساتھ مسلمانوں کو صفحہء ہستی سے مٹا دینے کے لئے صف آراء ہو چکی ہیں۔ اس وقت مسلکی تعصبات کو ہوا دے کر ملّی وحدت کو کمزور کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔ رنگ ونسل، حسب ونسب اور قومیت کے نام پر ملت کو تقسیم کرنے کا منصوبہ زور وشور سے جاری ہے۔ تاریخ کے اس نازک ترین موڑ پر ہمیں سوچنا ہوگا کہ آخر ہماری اس زبوں حالی اور ذہنی محکومی کی کیا وجوہات ہیں؟ ہم جو کبھی قافلہء سالار ہوا کرتے تھے اب بھٹکے ہوئے آہو کی طرح مارے مارے کیوں پھر رہے ہیں؟ ایک زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف کے ناموں سے قیصر وکسریٰ کے در و دیوار بھی دہل جاتے تھے، پھر آج کیوں ہم ڈر وخوف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے ہیں؟؟ تاریخ گواہ ہے ماضی میں ہماری قوم نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے اور ساحل پر کشتیاں جلا ڈالی تھیں، پھر اسی قوم کے ماننے والے آج کیوں پست حوصلہ اور کمزور ہو گئے ہیں؟؟؟ ایسے بے شمار سوالات ہے جس کے جوابات ہمیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینی

چاہیئے کہ جو قومیں آپسی اختلافات کا شکار ہو گئیں، ان کے اتحاد کا سورج ڈوب گیا، محکومی ان کا نصیب بن گیا اور زوال ان کا مقدر ٹھہرا۔ اس سے قبل بھی مسلمانوں کے آپسی اتحاد پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، ہزاروں تقریریں کی جاچکی ہیں، سیمینار اور کانفرنسیں کی جاتی رہی ہیں لیکن اب تک کوئی خاص نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے۔ ہمیں آج اس بات پر اتفاق کرنا ہو گا کہ اس وقت ہماری زبوں حالی کی سب سے بڑی وجہ آپسی انتشار اور مسلکی گروہ بندی ہے۔ آج ہم نے خود کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ہم حالات کی سنگینی سے کوئی سبق نہیں لے رہے۔ ہماری موجودہ پستی اور بے بسی کا سبب یہی ہے کہ ہم اس پیغام کو بھول رہے ہیں جس نے ماضی کے مسلمانوں کو محبت و اخوت کے ابدی رشتوں میں جکڑ دیا تھا اور انہیں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی صورت میں پرو دیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ چودہ سو سال قبل سر زمینِ عرب سے ایک قوم اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کا پیغام لے کر اُٹھی تھی جو شرک و کفر کے اندھیروں سے نکل کر توحید اور انصاف کی علمبردار بن گئیں۔ کچھ ہی عرصے میں کفر و شرک کا زور مٹ گیا۔ فتح و کامرانی اور عزت و توقیر صرف اہل ایمان کو نصیب ہوئی۔ لیکن آج جب ہم امت مسلمہ کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ آج ہماری اجتماعیت بکھر چکی ہے ہم مغربی تہذیب کو اپنا شعار بنا چکے ہیں، اور نظامِ کفر کی غلامی کو اپنی سعادت سمجھ رہے ہیں۔ اسی وجہ سے آج ہماری صفوں سے اتحاد و اتفاق کا تصور کمزور ہوتا جارہا ہے۔ اخلاقیات کی سطح پر ہماری شناخت مٹ چکی ہے۔ فکری سطح پر ہم اتنے پیچھے ہیں کہ کبھی سنجیدگی سے واعتصموا بحبل اللہ کے مفہوم و تقاضے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کیں، ہم نے اپنی زندگی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستوں پر گزارنے کی بجائے اپنی خواہشات نفس پر نچھاور کر دی ہے۔ ہم نے دینی تعلیمات سے کم اور اپنے نظریات سے زیادہ محبت رکھی۔ ہم نے ہمیشہ اپنے مسلک اور اپنے طریقہ کی تبلیغ کی اور واعتصموا بحبل اللہ کے سبق کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ہے۔ کیسا عجیب المیہ ہے کہ دنیا تو ہمیں مسلمان کہتی ہے، ہمیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر چلنے والی اور بنیان مرصوص صفت کی حامل قوم سمجھتی ہے لیکن ہم ہی اپنی علیحدہ شناخت بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہائے افسوس کہ ہماری عقلوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ ہم نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیا یہ بات غور کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہندوستان کے سینکڑوں فسادات میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے متعلق یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ کونسے مکتبہ فکر و مسلک سے وابستہ تھے۔

عراق، شام، فلسطین، افغانستان، برما اور کشمیر کے علاقوں میں شہید ہونے والے لاکھوں مسلمانوں سے کبھی ان سے مسلکی پہچان نہیں پوچھی گئیں۔ کاش ہم دشمنانِ اسلام کی ان سازشوں کو سمجھ پاتے۔۔!!!
اب سوال یہ ہے کہ جب امت مسلمہ کی زبوں حالی اور ذہنی محکومی کی وجہ معلوم ہو چکی ہے تو اس کے حل کی کوششیں کیوں نہیں ہو رہی ہیں اور اگر ہو رہی ہیں تو وہ کامیاب اور بااثر کیوں نہیں ہیں؟ اس کا آسان سا جواب یہی ہے کہ ہم اپنی صفوں کو مضبوط کرنا ہی نہیں چاہتے۔ آج ہر جماعت کے پاس اپنی ہی پالیساں بنی ہوئیں ہیں۔ آج جماعتوں اور ملی تنظیموں کے پاس اتحاد کا طریقہ کار بس یہی ہے کہ ہمارے پرچم تلے آجائو، ہماری دکان کے خریدار بن جائو تبھی تم فلاح پائو گے۔ آج ہر جماعت نے دین کے کسی نہ کسی ایک جُز کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اور ساری توانائیاں اسی ایک جُز کی ترویج و اشاعت میں لگا رہی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام کو متبادل نظام زندگی کے طور پر پیش کرنا یا زندگی کے تمام شعبوں پر اسلامی احکام و قوانین کو نافذ کرنا، اس مقصد حقیقی سے آج ملت کی بے شمار جماعتیں اور ادارے ناواقف ہیں۔ بے شمار جماعتوں نے اسلام کے کسی ایک ہی جُز کو اپنا مقصد و نصب العین بنا دیا ہے۔ چند عبادتوں اور فرائض سے آگے سوچنے اور کرنے کی کسی جماعت کے پاس آج مہلت ہی نہیں ہے۔ بعض جماعتوں نے شرک و بدعت کی کمر توڑنے کے لیے لاٹھی اُٹھا رکھی ہے تو کوئی صرف نماز کے لیے دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں خانقاہوں میں صرف پیر مریدی اور اللہ ہُو اللہ ہُو کی صدا تک بات محدود ہیں، تو بعض ملی جماعتوں کے نزدیک صرف سیاسی کوشش ہی دین کی سربلندی کا واحد راستہ ہے۔ کسی گروہ نے صرف خدمتِ خلق کو ہی اپنا حقیقی نصب العین بنالیا ہے۔ آج کئی دینی جماعتیں اور ملی تنظیمیں اپنے اپنے خود ساختہ نکاتوں پر کام کر رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ میں انتشار و افتراق پیدا ہو رہا ہے۔ عوام فروعی معاملات میں الجھ کر اصل دین سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم غیر شعوری طور پر دشمنانِ اسلام کی سازشوں کا حصہ بن رہے ہیں۔ اخوت اور بھائی چارگی، آپسی رواداری، خلوص، باہمی محبت جیسی اصطلاحوں کی اب کوئی معنویت ہی نہیں رہ گئی ہے۔ ہماری صفوں سے اتحاد ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے آپس کے معاملات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ کوئی ہم سے متاثر تو دور متنفر ہی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان ایثار، قربانی، محبت اور خلوص جیسے الفاظ اب صرف تحریر و تقریر کی ہی زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ ذہن نشین رہے کہ مسلمانوں کا آپسی اختلاف اور تفرقہ تمام مشکلات اور مسائل کی جڑ اور بنیاد ہے۔ قرآن میں

اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا ہے کہ اگر تم آپس میں اختلاف کروگے، تفرقہ کروگے، اتفاق واتحاد کو پس پشت ڈال دوگے تو پھر کمزور ہو جاؤگے، تمہاری طاقت و قوت، شان و شوکت سب ختم ہو جائیگی، تمہاری عظمت و عزت خاک میں مل جائیگی، اور تم ذلیل و خوار ہو جاؤگے۔ لہذا ہم اپنی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو کر حق و باطل کو خلط ملط کرنے سے بچنا ہوگا۔ اسلامی نظامِ زندگی کو نافذ کرنے کا مقصد ہی آج ملت میں آپسی اتحاد و اتفاق کو پیدا کر سکتا ہے۔ جب تک ہم اسلامی نظام کو قائم کرنا اپنا مقصد نہیں بنالیں گے تب تک ہمارا آپسی اتحاد کمزور ہی رہے گا۔ امت مسلمہ کی طاقت، قوت، عزت، غلبہ، کامیابی اور کامرانی کا ذریعہ آپسی اتحاد اتفاق ہی ہے۔ اور صرف اسی کے ذریعہ ہم اپنی عظمت رفتہ کو بحال کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہم ایسے ہی ذلت و رسوائی، کمزوری، بے بسی، محکومی اور ذہنی غلامی کی پستی میں گرتے رہیں گے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے فروعی و فقہی اور جزوی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اسلامی وحدت و اخوت اور بھائی چارگی کے رشتہ کو مضبوط و مستحکم کریں کیوں کہ موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ مسلمانوں کے اندر ایک ایسی مضبوط اور منظم قیادت اتحاد کی شکل میں ابھرے، جو مستقبل میں اسلامی نظامِ زندگی کے نفاذ کا ذریعہ بن سکیں۔

COVID-19اور ہماری ذمہ داریاں

تحریر: محمد معظم علی

COVID-19ایک ایسی اصطلاح ہے جو کہ موجودہ حالات میں زبان زدِعام ہے۔ اور یہ کچھ عجیب بھی نہیں لگتا کہ ہر کوئی اس پہ ہی بحث کرتا نظر آتا ہے۔ کوئی اس سے پریشان ہے تو کوئی زخیرہ اندوزی کا بازار گرم کئے بیٹھا ہے۔ کوئی اس مشکل وقت میں اللہ کے حضور اپنے گناہوں سے استغفار کر رہا ہے تو کوئی اس وقت میں بھی دنیاداری کو فوقیت دے تا نظر آرہا ہے۔ زیرِ نظر مضمون بلاشبہ کسی نئے عنوان پہ نہیں ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بحثیت ایک فرد، اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، خواہ وہ کسی بھی درجہ کی ہو۔

باؤلرز کی عمدہ کارکردگی کے بعد بلے بازوں کی ناقص کارکردگی، ڈیبیو کرنے والے نعمان علی بھی بول پڑے

COVID-19ایک ایسی بیماری ہے، جس کا موجب کورونا نامی وائرس ہے۔ اور یہ بیماری ملک چین کے صوبے ہوبی کے شہر ووہان سے شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس بیماری نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب اس بیماری کا بلاشبہ علاج تو تاحال دریافت نہیں ہوا، اور پوری دنیا کے طبی ماہرین سر جوڑ کے اس عالمی وبا کا علاج دریافت کر رہے ہیں، انشاءاللہ جلد ہی کوئی کامیابی ملے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ پاکستانیوں نے اس بیماری کو کتنا سنجیدہ لیا اور کیا احتیاطی تدابیر اختیار کیں، تو اس ضمن میں یہ بالکل واضح ہے ہماری قوم اس معاملے میں پریشان تو ہے، لیکن وہیں پہ ایک خاص تناسب میں لوگ تمام احتیاطی تدابیر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، سیر و تفریح اور سماجی روابط اس گرم جوشی سے قائم رکھے ہوئے ہیں، جیسے یہ کوئی معمولی بات ہو۔

مولانا فضل الرحمان نے نواز شریف اور زرداری کو بلاول اور مریم کی شکایت کردی، اپوزیشن اتحاد میں دراڑیں پڑنے کا خدشہ

بلاشبہ حکومت اس معاملے میں کافی سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی ہے، اور بہت سے ایسے احسن اقدام بھی اٹھا رہی ہے، جو کہ وقت کی ضرورت ہیں۔ اور جس سے عوام پہ بھی کافی مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ بے شک ہمارے ملک کی ایک بڑی تعداد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے، اور یہی ایک ایسا چیلنج

ہے جس کا عوام کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے سب سے زیادہ متاثر دیہاڑی دار طبقہ ہوا ہے۔ لیکن اگر دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ عارضی پابندیاں لگانے سے ہی وائرس کے پھیلاؤ کے روک تھام میں مدد ملے گی۔

اگر ہم بات کریں کہ اس عالمی وبا کے روک تھام میں سب سے زیادہ کیا چیز ضروری ہیں، اور بحیثیت ایک قوم، اور معاشرہ کیسے ہم ایک دوسرے کا سہارا بن سکتے ہیں۔

روک تھام کے لئے سب سے زیادہ ضروری سماجی روابط میں کمی ہے۔ انتہائی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو عوام روز کورونا کی کی تباہ کاریوں کا سن سن کے نفسیاتی مریض بن چکے ہیں، وہیں دوسری طرف گھر میں بیٹھنا، انکو سزا لگتا ہے۔ اور پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بجائے بیماری رکنے کے، پھیلتی ہی جاتی ہے۔ ایک اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں اس وبا کے مریضوں میں تقریباً 60 فیصد لوکل مریض ہیں، جن کے بیماری دوسرے باہر سے آنے والے مریضوں سے منتقل ہوئی۔ لیکن عوام کے سر پہ جوں تک نہیں رینگتی۔

دوسری اہم چیز جو کہ اس وبا کے روک تھام میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے، وہ ہے صفائی کا خاص خیال رکھنا۔ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں، اور ہمارے دین نے ہمیں سکھایا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے، اور ساتھ ہی ساتھ پنجگانہ نماز کی ادائیگی کے لئے وضو کرنے سے بھی ہمارا جسم بھی صاف ہو جاتا ہے اور روح بھی۔ حال ہی میں آنے والی ایک غیر ملکی رپورٹ کے مطابق دوسرے ممالک میں اس وبا کے پھیلنے کی اہم وجہ بدن کی صفائی کا ناقص اہتمام ہے۔ پانی کا کوئی نعم البدل نہیں، جب کہ وہاں ٹشو پیپر کے استعمال سے وقتی طور پہ جسم صاف ہو بھی جائے لیکن، بہترین اور مکمل صفائی پھر بھی ادھوری رہ جاتی ہے۔

COVID-19 صرف ایک وبا ہی نہیں، بلکہ ایک آزمائش بھی ہے۔ اور اس آزمائش میں پورا اترنے کے لئے کچھ ایسے اہم اقدام ہیں، جو کہ ہمیں حکومتی سطح کے علاوہ اپنے ذاتی درجہ پہ اپنے معاشرہ، اپنے ارد گرد کے لوگوں سے معاملات کرنے چاہئیں۔

ا۔ بہن بھائیوں کی مدد: اس مدد سے مراد صرف راشن لے کے دینا ہی نہیں ہے بلکہ تمام ضرورتمند حضرات کو انکے گھر کی دہلیز پہ انکا حصہ پہنچانے کا اہتمام کرنا چاہیئے، اور کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کی دیگر

بنیادی ضروریات کا بھی خیال رکھا جائے۔ آج کل ایک عام رجحان یہ پایا جارہا ہے، کہ بہن بھائیوں کی مدد کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ایک فوٹو سیشن منعقد کروایا جاتا ہے کہ جس میں صاحبانِ ثروت اپنی امارت اور دریا دلی کا لوہا منوانے کے لئے جتن کرتے ہیں۔ ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ اتنی رازداری سے صدقہ کرو کے دوسرے ہاتھ کو بھی پتا نہ چلے۔

"کپڑے کے اوپر سے جسم کو چھونا جنسی ہراسانی نہیں" بھارتی عدالت نے کیس کا حیران کن فیصلہ سنا دیا

۲۔ عبادات کا خاص اہتمام: اللہ بزرگ و برتر، تمام تعریفوں کا مالک ہے۔ اسی نے یہ جہان بنایا، تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ ہر خوشی ہر غم، ہر آسانی، ہر آزمائش اس اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ بلاشبہ یہ وبا بھی ایک آزمائش ہے، اور اس آزمائش میں ہمیں چاہیئے کہ بجائے یہ کہ ہم وقت کو برباد کریں، بلکہ زیادہ سے زیادہ اللہ عزوجل کے آگے سجدہ ریز ہونے کی کوشش کریں، استغفار کو اپنا معمول بنائیں۔ اللہ کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوط کریں۔ گناہوں سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کریں، اور اپنے گناہوں سے معافی طلب کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سچا مسلمان بنائے۔

اسلام آباد ہائی کورٹ نے آن لائن امتحان سے متعلق نجی یونیورسٹی کے طلبا کی درخواست نمٹادی

۳۔ صحتمند مصروفیات: ایک اہم بات یہ کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنا وقت غیر ضروری سرگرمیوں میں گزاریں، ہمیں چاہیئے کہ ایسی سرگرمیاں اپنی زندگی کا جزو بنائیں، جس سے ہماری جسمانی اور روحانی صحت پہ مثبت اثرات مرتب ہوں۔ صبح کی سیر، جسمانی کثرت کی پابندی صحت کے لئے ضروری ہے بالکل اسی طرح، اچھی کتب کا مطالعہ، اور کوئی ایسی مثبت سرگرمی بھی فائدہ مند ہے، جسکا آپکو بھی فائدہ ہو، معاشرہ بھی بہرہ مند ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ ہمیں گناہ معاف فرمائے اور اپنے حبیبِ مصطفی ﷺ کے صدقے اس آزمائش سے ہمیں بحفاظت نکالے، اور اس وبا سے نجات عطا کرے۔ آمین۔

کروناوائرس: آزمائش انسانیت اور ہماری ذمہ داریاں

آج کل پوری دنیامیں کرونا کی وجہ سے سناٹا چھایاہوا ہے۔ انسان سہما ہوا ہے خوف نے اذہان کو اپنے قابو میں جکڑر کھاہے، کاروبار حیات قریب قریب جام ہو کر رہ گیااور اس وبا کے خاتمہ (انشاء اللہ) کے بعد دنیا ادوار کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم ہوتی نظر آرہی ہے، دنیا قبل از کروناوائرس اور دنیا بعد از کرونا وائرس۔ قدرت نے غافل ہوتی دنیا کو یہ پیغام دیاہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور سب کچھ اس کے کن کہنے سے ہو جانے اور بن جانے کا پابند ہے کروناوباء خداوند کریم کی طرف سے انسانیت کیلئے ایک بڑی آزمائش ہے، یوں تو انسان ابتداء سے اب تک اور قدیم سے جدید تک آزمائشوں اور حوادث کا شکار رہاہے، بلکہ کہا جاسکتاہے کہ جب بھی انسان نے قدرت کی طرف سے متعین حدود سے متجاوز ہونے کی کوشش کی تو کسی نہ کسی آزمائش کے ذریعے روک دیا گیااور انسان کارخ توبہ کی طرف پلٹ دیا گیا۔

<u>باؤلرز کی عمدہ کارکردگی کے بعد بلے بازوں کی ناقص کارکردگی، ڈیبیو کرنے والے نعمان علی بھی بول پڑے</u>

اس پر آشوب دور میں نہ صرف خود بچناضروری ہے، بلکہ دوسروں کو بچانااور محفوظ کرنا ہماری اولین ذمہ داری ہے، قدرت نے ہر انسان کو کچھ مخصوص صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے جن کو اس وقت پوری استطاعت کے ساتھ عمل میں لانے کا بہترین موقع ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس آزمائش کی گھڑی میں صرف خود کو بچا کر یا صرف خود کو بچانے کی کوشش کرکے ہم پھر سے غضب خداوند کو دعوت تو نہیں دے رہے، اگر مصیبت کی وجہ سے رجوع الی اللہ ہو جائے تو یہ آزمائش اور رحمت ہے اور بغاوت یا خود غرضی پر آجائے تو یہ عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ آزماتا ضرور ہے لیکن طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، یہ اس کا وعدہ ہے نیز کائنات کا کوئی غم ایسا نہیں ہے جو آدمی برداشت نہ کر سکے، یہ وقت شکوہ وشکایت کا بھی نہیں بلکہ ہمت حوصلہ اور تدبر کا ہے اگر کسی ذمہ دار کی طرف سے ان حالات میں کوئی کوتاہی ہو بھی گئی ہے یا وہ اپنی ذمہ داریاں احسن طریقہ سے پوری نہیں کر سکا تو بھی کوئی بات نہیں تنقید اور گلہ سے پرہیز ضروری ہے نیز انفرادی ذمہ داری ہے کہ اپنے حصے کا دیا جلایا جائے۔

مولانا فضل الرحمان نے نواز شریف اور زرداری کو بلاول اور مریم کی شکایت کر دی، اپوزیشن اتحاد میں دراڑیں پڑنے کا خدشہ

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا

تم بھی اپنے حصے کی کوئی شمع جلائے جاتے

جس حد تک ممکن ہو اس سے بچاؤ اور تحفظ کی تدابیر کرنی ہیں حالات متقاضی ہیں کہ ہر فرد اپنی طاقت، استطاعت، علم اور وسائل و ہنر کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنا کردار ادا کرے، اس وقت مثبت رویوں کی شدید ضرورت ہے خود بھی پر امید رہیں اور دوسروں کو بھی اچھی امید دلائیں، مثبت سوچ اور اچھی امید بھی بہترین ہیںImmunities اس ساری صورتحال میں جبکہ دنیا پریشان و تباہ کن ہے، انسانیت کا مثبت پہلو بھی پوری طرح جلوہ گر ہوا ہے خاص کر پاکستانی معاشرہ کے حوالے سے الحمد اللہ یہ بات عیاں ہوئی ہے کہ ہمدردی خلوص اور دوسروں کی مدد کا پہلو ہمارے خون میں شامل ہے، جس طرح فلاحی تنظیموں اور افراد نے ایک دوسرے کی وسیع قلبی کیساتھ مدد کی ہے، قابل ستائش ہے اسی طرح ڈاکٹرز اور الائیڈ سٹاف اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر متاثرہ مریضوں کی صحت یابی کیلیئے اپنی جانوں کی پرواکئے بغیر شب و روز کوشاں ہے، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو جلا بخشے اور انسانیت پر اپنا کرم کرتے ہوئے اس وفا سے نجات بخشے۔

کرونا وائرس اور ہماری ذمہ داریاں

کرونا وائرس کی وباء انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ بننے جا رہی ہے ۔ جس نے پوری دنیا کے افراد کے ساتھ ساتھ ملکوں اور حکومتوں پر بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں ۔ وطن عزیز پاکستان کی بات کریں تو یہاں بھی کورونا وائرس ایک بڑا چیلنج بن کر ابھرا ہے، جس نے متعدد نئے مسائل اور مشکالات کو جنم دیا ہے۔ ملکی معیشت ہو یا عام آدمی کی معاشی حالت سب ہی کورونا وائرس سے متاثر ہو رہے ہیں۔

کرونا وائرس کے متعلق جاننے کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل نکات کا جاننا ضروری ہے :-

- کرونا وائرس کیا ہے؟
- کرونا وائرس کی تشخیص
- کرونا وائرس کا علاج
- حکومتی سطح پر اقدامات اور ذمہ داریاں
- فلاحی تنظیموں اور مخیر حضرات کا کردار اور ذمہ داریاں
- عوامی ردِ عمل اور ذمہ داریاں

کرونا وائرس : ایک بہت بڑی وائرس فیملی کا ایک مہلک وائرس ہے جو عمومی طور پر بخار سے لے کر سانس کی پیچیدہ بیماریوں کے لیے جانا جاتا ہے ۔اس کی ابتدائی شکلیں سارس (SARS) کی صورت میں دنیا دیکھ چکی تھی ۔ لیکن کرونا وائرس (COVID-19) کو چین کے شہر وہان میں پہلی مرتبہ 2019ء میں دیکھا گیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے ترقی یافتہ ممالک سے ہوتا ہوا پوری دنیا میں پھیل گیا۔ وہ ممالک جن کو اپنے حفظانِ صحت کے اقدامات کی وجہ سے پوری دنیا جانتی تھی وہ بھی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ حفاظتی اقدامات نہ کرنے والے تو سب سے پہلے اس کا شکار ہوئے۔بقول شاعر:

وائرس کے وار میں مارے گئے
درد کے پندار میں مارے گئے
ناز جن کو تھا خدائی پر بہت

وہ بھرے دربار میں مارے گئے

حالیہ دنوں میں کرونا وائرس نے دنیا کے 176 ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اس وائرس کی تباہ کاریوں سے لاکھوں افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ اس وائرس کی دہشت نے پوری دینا کو لاک ڈاؤن کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔بقول شاعر:

ایسی ترقی پر تو رونا بنتا ہے
جس میں دہشت گرد کرونا بنتا ہے

کرونا وائرس کی ابتدائی علامات:

1. مسلسل خشک کھانسی جس میں چوبیں گھنٹوں میں تین سے چار مرتبہ کھانسی کے شدید دورے۔
2. مسلسل بخار جو 37.8 سیلسیئس یا 100 فارن ہائٹ تک جائے۔
3. سونگھنے اور چکھنے کی حِس کا ختم ہو جانا یا کم ہو جانا۔
4. اچانک جسم میں سستی محسوس ہونا۔

سب سے پہلے یہ وائرس سانس کے ذریعے پھیپھڑوں اور اس سے متعلقہ خلیوں کو متاثر کرتا ہے۔ عموماً انفیکشن لگنے اور علامات کے ظاہر ہونے میں پانچ سے چھ دن لگ جاتے ہیں۔ابتدا میں تینوں علامتیں یا کوئی ایک علامت کا مسلسل رہنا کرونا وائرس کے حملہ کی ابتدا ہو سکتی ہے اگر ایسا ہو تو فوراً اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیں اور کرونا ٹیسٹ کروائیں اور رزلٹ آنے تک آئسو لین میں چلے جائیں۔ اگر ٹیسٹ مثبت آیا ہے تو گھر میں موجود تمام افراد کو خود سے الگ تھلگ کر لیں اور یہ سمجھیں ۔بقول شاعر:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

مشروبات کا استعمال زیادہ کرنا شروع کر دینا چاہیے۔ ابتدا میں پیراسیٹامول کا استعمال اور گرم سوپ اور دیسی قہوے راحت کا باعث بنتے ہیں لیکن بیماری کی پیچیدگیوں میں فوری طور پر قریبی ہسپتال رابطہ کرنا چاہیے۔

میرے خیال میں حکومت پاکستان نے وباء سے نمٹنے کے لئے بروقت اور بڑے اقدامات کیے جن میں مستحق افراد اور غرباء پر خصوصی توجہ دی گئی۔ پاکستان میں دیگر ممالک کی طرح فوری لاک ڈاؤن نہیں کیا گیا اور نہ ہی کرفیو لگایا گیا بلکہ غریب طبقہ کی معاشی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے لاک ڈاؤن کیا گیا، جس میں نرمی کر کے سمارٹ لاک ڈاؤن میں تبدیل کیا جا رہا ہے، جس سے کسی حد تک عام آدمی کو راحت اور معاشی سکون محسوس ہوا ہے تاہم ان تمام تر اقدامات کے باوجود ملکی معیشت بری طرح متاثر ہوئی ہے اور لوگوں کے معمولات زندگی پر برے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

وزیراعظم پاکستان نے لاک ڈاؤن کے پیش نظر غرباء اور مستحقین کی مدد کیلئے احساس پروگرام متعارف کروایا جس کے پہلے مرحلے میں مستحق افراد تک شفاف طریقے سے 12 ہزار روپے فی گھرانہ تقسیم کیے گئے جس سے یقینا غریب طبقے کو کافی حد تک مدد ملی۔ احساس پروگرام کے ساتھ ساتھ حکومت نے ریلیف کے متعدد پروگرام بھی شروع کئے، جن میں بجلی و گیس کے بلوں میں ریلیف جیسے اقدامات بھی شامل ہیں۔

ریلیف کے ساتھ ساتھ حکومت نے لوگوں کو کورونا وائرس کی احتیاطی تدابیر کے حوالے سے تعلیم اور ترغیب بھی دی۔ اس کے لیے روایتی میڈیا اور سوشل میڈیا پر آگاہی مہم چلائی گئی ۔حکومتی احکامات کو کافی حد تک عوامی پذیرائی بھی حاصل ہوئی تاہم یہ تمام اقدامات اس وقت تک ناکافی ہیں جب تک مکمل عوامی تعاون کے ساتھ ان پر عمل درآمد نہ کیا جائے گا۔ عوام کو چاہیے کہ لاپرواہی نہ کریں، احتیاطی تدابیر اختیار کریں اور حکومت کی جانب سے دیے گئے ایس۔او۔پیز پر مکمل عمل کریں اور جن علاقوں میں سمارٹ لاک ڈاؤن کیا گیا ہے وہاں پر بھی حکومت کا ساتھ دیں تاکہ کورونا وائرس کے مزید پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔

کرونا وباء کے دوران ریلیف کے کاموں میں حکومت کے ساتھ ساتھ سماجی تنظیموں اور مخیر حضرات کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے تاکہ مستحقین کی مدد میں کوئی کمی نہ رہے نہیں۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ خدمت اور خیرات پاکستانیوں کے خون میں شامل ہے۔ سیلاب، زلزلہ؛ یا کوئی اور مشکل گھڑی ہو پاکستانی ہمیشہ اپنے ہم وطنوں کی مدد میں پیش پیش رہے ہیں

۔ اس روایت کو زندہ رکھتے ہوئے کورونا کی وباء میں بھی پاکستانی غریب شہریوں کی مدد بڑھ چڑھ کر رہے ہیں۔

کرونا کی وباء میں سماجی تنظیموں کا کردار نہایت مثبت رہا ہے۔ ان اداروں نے ایک طرف تو لوگوں کو اس کرونا وباء سے بچنے کے لئے آگاہی دی ہے جبکہ دوسری طرف بڑے پیمانے پر فلاحی کام بھی شروع کر رکھے ہیں۔ ان فلاحی تنظیموں کی طرف سے ہسپتالوں میں مفت طبعی سہولیات فراہم کی جارہی ہیں جن میں طبعی ماسک، اینٹی وائرس سینی ٹائزرز، حفاظتی کٹس، ٹیسٹنگ کٹس، وینٹی لیٹرز، نئی آئسو لیشن وارڈز کے لیے فنڈ، مستحقین کیلئے کھانا و دیگر سہولیات شامل ہیں۔

اس کے علاوہ غریب بستیوں میں جا کر بھی مستحقین اور غریب افراد میں بھی ماسک، امدادی پیکیج، راشن و دیگر اشیائے ضروریہ تقسیم کیے جارہے ہیں جو قابل تحسین بات ہے۔

ہماری ذمہ داریاں:

خصوصی افراد کو وباء کے دوران سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے ان کی طرف حکومتی، سماجی اداروں اور مخیر حضرات کو خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ تاکہ وہ مشکل حالات اور مسائل سے نکل سکیں۔ سرکاری سطح پر ملک بھر میں موجود خصوصی افراد کا ڈیٹا مرتب کیا جائے تاکہ وہ امدادی پیکیج سے محروم نہ رہیں۔

خصوصی افراد کے ساتھ ''اقلیتیں'' کو بھی امدادی سکیموں میں شامل کیا جانا چاہیے۔ خصوصاً خاکروب و نچلا عملہ جو مختلف ہسپتالوں و مختلف مقامات پر کام کرتے ہیں معاشی مدد کے ساتھ ساتھ ایسے عملے کو حفاظتی کٹس اور دیگر اشیاء فراہم کی جائیں۔

تیسرا طبقہ ''خواجہ سراء'' ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے پاس عموماً شناختی کارڈ نہیں ہیں۔ نادرا میں رجسٹریشن نہ ہونے کی وجہ سے وہ احساس پروگرام جیسے بنیادی فنڈ سے محروم ہیں۔ کیونکہ حکومت کے پاس ان کا مکمل ڈیٹا موجود نہیں ہے لہذا ان افراد کو بھی امدادی پیکیج دیے جائیں۔

خواتین جو اپنے گھر کی واحد کفیل ہیں معاشرے کا چوتھا نظر انداز ہونے والا طبقہ ہے ان میں بیوہ عورتیں جو خود گھر کی سربراہ اور اپنے خاندان کا واحد سہارا ہوتی ہیں اس مشکل وقت میں انہیں سہارے کی ضرورت ہے۔ ایسی خواتین کے حوالے سے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت، سماجی تنظیموں، مخیر حضرات اور خود علاقے کے افراد کو ان کی مدد کرنی چاہیے۔

یہ جو ملاتے پھرتے ہو تم ہر کسی سے ہاتھ
ایسا نہ ہو کہ دھونا پڑے زندگی سے ہاتھ

آخر پر میں پاکستانی شہریوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ انتہائی عقلمندی اور ہوش سے کام لینا ہو گا ہمیں ایسا رویہ اختیار کرنا ہو گا کہ جس سے ہماری ذات کے ساتھ ساتھ کسی بھی شہری کو نقصان نہ ہو۔ اس کے لئے چند باتوں پر عمل درآمد بہت ضروری ہے۔

- حکومتی اقدامات اور ہدایات پر بھرپور عمل کیا جائے۔
- ہمیشہ مصدقہ خبر ہی شئیر کریں تاکہ لوگوں کو گمراہی سے بچایا جا سکے۔
- اپنے خاندان کی نقل و حرکت کو محدود کر دیں۔
- اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ خاص طور پر بچوں اور 50 سال سے زائد عمر کے لوگ کسی صورت گھر سے باہر نہ نکلیں۔
- گھر کے تمام افراد روزانہ دس سے پندرہ بار ہاتھ دھوئیں اور ہر بار تیس سیکنڈ کا دورانیہ ہو۔
- ہینڈ سینی ٹائزر کا استعمال دن میں کئی بار کیا جائے۔
- جب بھی انتہائی ضروری کام سے گھر سے باہر جائیں تو فیس ماسک پہن لیں۔
- کسی بھی شخص سے مصافحہ نہ کریں۔
- تمام قسم کی چھوٹی بڑی تقریبات میں شرکت نہ کریں۔
- گھر پہنچتے ہی ہاتھوں کو صابن سے دھوئیں۔

گھر رہیے کہ باہر ہے اک رقص بلاؤں کا

اس موسم وحشت میں نادان نکلتے ہیں

یہ ایسی ہدایات ہیں جن پر عمل درآمد کر کے ہم اپنے آپ اور خاندان کو کرونا وائرس سے بچا سکتے ہیں اور اس وائرس کو پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے آپ کا یہ عمل آپ کے ذمہ دار ہونے اور پاکستان کو کرونا سے ختم کرنے کا سبب بنے گا۔ اس دوران اگر کوئی شخص جس میں اس وائرس کی علامات ظاہر ہوں تو فوری طور پر حکومت کی جانب سے جاری کردہ ہیلپ لائن پر اطلاع دے تاکہ اس کا علاج ممکن ہو سکے۔

اور آخر پر اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے اور لوگوں کو ایک مشورہ بھی ہے تاکہ اس وباء سے بچا جا سکے ہے۔

روز تسبیح کیا کر کہ یہ دن کٹ جائیں

حمد اور نعت لکھا کر کہ یہ دن کٹ جائیں

لوگ اب دیر و حرم جاتے ہوئے ڈرتے ہیں

کوئی تدبیرِ شفا کر کہ یہ دن کٹ جائیں

تعلیم نسواں

دولت علم سے بہرہ مند ہونا ہر مرد وزن کے لئے لازمی امر ہے۔ ترقی صرف اس قوم کی میراث ہے جس کے افراد زور علم سے آراستہ و پیراستہ ہو۔ علم کے بغیر انسان خدا کو بھی پہنچاننے سے قاصر ہے۔ کسی بھی عمل کے لئے علم ضروری ہے کیوں کہ جب علم نہ ہو گا تو اس پر عمل کیسے ہو سکے گا۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے بھی حصول علم لازمی ہے۔ اسلام نے مرد و عورت دونوں کے حصول علم کی تاکید کی ہے خواہ اس کے لئے دور دراز کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ علم ایک ایسا بہتا دریا ہے جس سے جو جتنا چاہے سیر اب ہو سکتا ہے لیکن شرط محنت اور لگن ہے۔ زندگی کے اقدار میں نکھار اور وقار علم سے ہی آ سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت و مرد دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ ترقی کی راہوں پر آگے بڑھنے کے لئے عورتوں کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مردوں کے لئے گویا عورت اور مرد ایک گاڑی کے دوہ پہیے ہیں جن میں سے ایک کی بھی علم سے لاتعلقی کائنات کے نظام کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ خواتین کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ بچوں کی پرورش' ان کی نگہداشت اور صحیح تربیت ہوتی ہے۔ بچے کی ابتدائی درسگاہ دراصل ماں کی گود ہوتی ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ اور سلیقہ شعار ہو تو اولاد بھی صاحب علم اور مہذب ہو گی۔ بچے اپنی ماں سے طور طریقے اور آداب و اطوار حاصل کرتے ہیں۔ ایک ماں ہی اپنی اولاد کے خیالات اور کردار کو سنوارنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جب ماں کی بنیادیں مستحکم ہوں گی تو بچے بھی معاشرے کے اہم فرد کی حیثیت سے ابھر سکتے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ

<u>سندھ: 14 کورونا ویکسینیشن سینٹرز قائم، تربیت یافتہ عملہ اور سامان پہنچا دیا گیا</u>

"وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ"

یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کو مجموعی طور پر دین سے روشناس کرانے' تہذیب و ثقافت سے بہرہ ور کرنے میں اس قوم کی خواتین کا اہم بلکہ مرکزی اور اساسی کردار ہوتا ہے اور قوم کے نونہالوں کی صحیح اٹھان اور نشوونما میں ان کی ماؤں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ ماں کی گود بچے کا اولین مدرسہ ہے۔ اس لئے شروع ہی سے اسلام نے جس طرح مردوں کے لئے تعلیم کی تمام تر راہیں ہموار کی ہے ان کو ہر قسم کے مفید علم کے حصول کی نہ صرف آزادی دی ہے بلکہ اس پر ان کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ جس کے نتیجے میں ابتداء سے لے کر آج تک ایک سے بڑھ کر ایک ماہر علم و فن اور تاجور فکر و

تحقیق پیدا ہوتے رہے اور زمانہ ان کے علوم سے بے مستفیض ہوتا رہا بالکل اسی طرح اس دین نے خواتین کو بھی تمدنی، معاشرتی کی حقوق بہ تمام وکمال عطا کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی حقوق بھی اس کی صنف کا لحاظ کرتے ہوئے مکمل طور پر دیے ہیں۔ چنانچہ ہر دور میں مردوں کے شانہ بشانہ اسلام میں ایسی باکمال خواتین بھی جنم لیتی رہی جنہوں نے اطاعت گزار بیٹی، وفا شعار بیوی اور سراپا شفقت بہن کا کردار نبھانے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اپنے علم و فضل کا ڈنکا بجایا اور ان کے دم سے تحقیق و تدقیق کے لاتعداد خرمن آباد ہوئے۔ اسلام نے تعلیم کو مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں طور پر فرض قرار دیا ہے۔ حدیث ہے۔

عمران خان کا احتساب، کرپشن کا جھوٹا چورن ختم ہو گیا: غلام دستگیر خان

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"

آبادی کا تقریباً نصف عموماً خواتین پر مشتمل ہے جن کی متوازن شرکت کے بغیر مطلوبہ ترقی نہیں ہو سکتی جو کہ صرف تعلیم نسواں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ماں کے قدموں ب تلے جنت کا ہونا بھی اس باعث ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت میں ماں کا کردار بہ نسبت باپ زیادہ کی اہمیت ہے۔ عورت کی تعلیم پورے خاندان کی تعلیم ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت ہی اولاد کے ہمہ پہلو تکمیل کر سکتی ہے۔ ماں کے کردار کے علاوہ خواتین ڈاکٹر یا نرس، ماہر امور خانہ داری، ذمہ دار پولیس آفیسر اور احساس وکیل کے طور پر معاشرے کی ترقی میں موثر کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ (افشاں پرویز عالم، کراچی)

اسلام میں تعلیمِ نسواں اور موجودہ مخلوط نظامِ تعلیم

از: مولوی نایاب حسن قاسمی
اسکالر شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

اسلام میں علم کی اہمیت

بلاشبہ علم شرافت وکرامت اور دارین کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کا بہترین ذریعہ ہے، انسان کو دیگر بے شمار مخلوقات میں ممتاز کرنے کی کلید اور ربّ الارباب کی طرف سے عطا کردہ خلقی اور فطری برتری میں چار چاند لگانے کا اہم سبب ہے؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مقصدِ تخلیقِ انسانی تک رسائی علم ہی کے ذریعے ممکن ہے، علم ہی کی یہ دولت انسانوں نے سنگلاخ وادیوں، چٹیل میدانوں اور زمینوں کو مَرغ زاری عطا کی ہے، سمندروں اور زمینوں کی تہوں سے لاتعداد معدنیات کے بے انتہا ذخائر نکالے ہیں اور آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں کو چیر کر تحقیق واکتشاف کے نت نئے پرچم لہرائے ہیں؛ بلکہ مختصر تعبیر میں کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے تمام محیر العقول کارنامے علم ہی کے بے پایاں احسان ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے ظہور کے اولِ دن سے ہی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر "اقرأ" کے خدائی حکم کے القاء کے ذریعہ جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں علم کی عظمت واہمیت کو جاگزیں کیا اور "قرآنِ مقدس" میں بار بار عالم وجاہل کے درمیان فرق کے بیان اور جگہ جگہ حصولِ علم کی ترغیب کے ذریعے اس کی قدر ومنزلت کو بڑھایا؛ چنانچہ قرآنِ کریم میں علم کا ذکر اسّی بار اور علم سے مشتق شدہ الفاظ کا ذکر سیکڑوں دفعہ آیا ہے، اسی طرح عقل کی جگہ "الباب" (جمع لب) کا تذکرہ سولہ دفعہ اور "عقل" سے مشتق الفاظ اٹھارہ جگہ اور "فقہ" سے نکلنے والے الفاظ اکیس مرتبہ مذکور ہوئے ہیں، لفظ "حکمت" کا ذکر بیس دفعہ اور "برہان" کا تذکرہ سات دفعہ ہوا ہے، غور وفکر سے متعلق صیغے مثلاً: "دیکھو" "غور کرو" وغیرہ، یہ سب ان پر مستزاد ہیں۔

قرآن کریم کے بعد اسلام میں سب سے مستند، معتبر اور معتمد علیہ لٹریچر (Literature) احادیثِ نبویہ کا وہ عظیم الشان ذخیرہ ہے، جسے امت کے باکمال جیالوں نے اپنے اپنے عہد میں انتہائی دقتِ

نظری، دیدہ ریزی اور جگر کاوی کے ساتھ اکٹھا کرنے کا ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا ہے، جب ہم اس عظیم الشان ذخیرے کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں قدم قدم پر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم زبانِ مقدس علم کی فضیلت، حاملینِ علم فضیلت اور اس کے حصول کی تحریض وترغیب میں سرگرم نظر آتی ہے؛ چنانچہ تمام کتبِ حدیث میں علم سے متعلق احادیث کو علیحدہ ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے

چنانچہ امام بخاریؒ کی صحیح میں ابوابِ وحی و ایمان کے بعد "کتاب العلم" کے عنوان کے تحت ابواب میں حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانیؒ کے بہ قول چھیاسی مرفوع حدیثیں (مکررات کو وضع کرکے) اور بائیس آثارِ صحابہ وتابعین ہیں، اسی طرح صحاحِ ستہ کی دیگر کتب اور "موطا مالک" میں بھی علم کا علیحدہ اور مستقل باب ہے "مسند امام احمد بن حنبلؒ" کی ترتیب سے متعلق کتاب الفتح الربانی" میں علم سے متعلق اکاسی احادیث ہیں، حافظ نورالدین ہیثمیؒ کی "مجمع الزوائد" میں علم کے موضوع پر احادیث بیاسی صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں، "مستدرک حاکم" میں علم سے متعلق حدیثیں چوالیس صفحات میں ہیں، مشہور ناقد حدیث اور جلیل القدر محدث حافظ منذریؒ کی "الترغیب والترہیب" میں علم سے متعلق چودہ احادیث ہیں اور علامہ محمد بن سلیمانؒ کی "جمع الفوائد" میں صرف علم کے حوالے سے ایک سو چون حدیثیں بیان کی گئی ہیں۔

اسلام میں خواتین کی تعلیم کی اہمیت

یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کو مجموعی طور پر دین سے روشناس کرانے، تہذیب وثقافت سے بہرہ ور کرنے اور خصائل فاضلہ وشمائلِ جمیلہ سے مزین کرنے میں اس قوم کی خواتین کا اہم؛ بلکہ مرکزی اور اساسی کردار ہوتا ہے اور قوم کے نونہالوں کی صحیح اٹھان اور صالح نشوونما میں ان کی ماؤں کا اہم رول ہوتا ہے؛ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ماں کی گود بچے کا اولین مدرسہ ہے؛ اس لیے شروع ہی سے اسلام نے جس طرح مردوں کے لیے تعلیم کی تمام تر راہیں وا رکھی ہیں ان کو ہر قسم کے مفید علم کے حصول کی نہ صرف آزادی دی ہے؛ بلکہ اس پر ان کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے، جس کے نتیجے میں قرنِ اول سے لے کر

آج تک ایک سے بڑھ کر ایک کج کلاہِ علم و فن اور تاجورِ فکر و تحقیق پیدا ہوتے رہے اور زمانہ ان کے علومِ بے پناہ کی ضیاپاشیوں سے مستنیر و مستفیض ہوتا رہا، بالکل اسی طرح اس دین حنیف نے خواتین کو بھی تمدنی، معاشرتی اور ملکی حقوق کے بہ تمام وکمال عطا کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی حقوق بھی اس کی صنف کا لحاظ کرتے ہوئے مکمل طور پر دیے؛ چنانچہ ہر دور میں مردوں کے شانہ بہ شانہ دخترانِ اسلام میں ایسی باکمال خواتین بھی جنم لیتی رہیں، جنھوں نے اطاعت گزار بیٹی، وفاشعار بیوی اور سراپا شفقت بہن کا کردار نبھانے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اپنے علم و فضل کا ڈنکا بجایا اور ان کے دم سے تحقیق و تدقیق کے لاتعداد خرمن آباد ہوئے۔

خواتین کی تعلیم سے متعلق روایات

(۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ثَلَاثَۃٌ لَھُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَھْلِ الْکِتَابِ آمَنَ بِنَبِیِّہٖ، وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ، وَالعبدُ الْمَمْلُوکُ اِذَا أَدّٰی حقَ اللّٰہِ، وحَقَّ مَوَالِیْہِ، وَرَجُلٌ لَہٗ أَمَۃٌ، فَأَدَّبَھَا فَأَحْسَنَ تَأدِیْبَھَا، وَعَلَّمَھَا، فَأَحْسَنَ تَعْلِیْمَھَا، ثُمَّ أَعْتَقَھَا، فَتَزَوَّجَھَا، فَلَہٗ أَجْرَانِ" (۱) اس حدیث کے آخری جزء کی شرح میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ: "یہ حکم صرف باندی کے لیے نہیں؛ بلکہ اپنی اولاد اور عام لڑکیوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔" (۲)

(۲) ایک صحابیہ حضرت شفاء بنت عدویہؓ تعلیم یافتہ خاتون تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: "تم نے جس طرح حفصہ کو "نملہ" (پھوڑے) کا رقیہ سکھایا ہے، اسی طرح لکھنا بھی سکھادو۔" (۳)

(۳) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی عورتوں کی تعلیم کا اہتمام فرماتے تھے اور ان کی خواہش پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باضابطہ ان کے لیے ایک دن مقرر کردیا تھا، حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے: "قَالَتِ النِّسَاءُ لِلنَّبِيِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: "غَلَبَنَا عَلَیْکَ الرِّجَالُ، فَاجْعَلْ لَنَا یَوْمًا مِنْ نَفْسِکَ، فَوَعَدَھُنَّ یَوْمًا لَقِیَھُنَّ فِیْہِ، فَوَعَظَھُنَّ، وَأَمَرَھُنَّ" (۴)۔

(۴) حضرت اسماء بنت یزید بن السکن انصاریہ بڑی متدین اور سمجھدار خاتون تھیں، انھیں ایک دفعہ عورتوں نے اپنی طرف سے ترجمان بناکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم سے دریافت کریں کہ: "اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرد وعورت ہر دو کی رہ نمائی کے لیے مبعوث فرمایا ہے؛ چنانچہ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی، مگر ہم عورتیں پردہ نشیں ہیں، گھروں میں رہنا ہوتا ہے، ہم حتی الوسع اپنے مردوں کی ہر خواہش پوری کرتی ہیں، ان کی اولاد کی پرورش وپرداخت ہمارے ذمے ہوتی ہے، ادھر مرد مسجدوں میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں، جہاد میں شریک ہوتے ہیں، جس کی بناپر انھیں بہت زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے؛ لیکن ہم عورتیں ان کے زمانۂ غیبوبت میں ان کے اموال واولاد کی حفاظت کرتی ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ان صورتوں میں ہم بھی اجر وثواب میں مردوں کی ہمسر ہوسکتی ہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء کی بصیرت افروز تقریر سن کر صحابہ کی طرف رخ کیا اور ان سے پوچھا: "اسماء سے پہلے تم نے دین کے متعلق کسی عورت سے اتنا عمدہ سوال سنا ہے؟" صحابہؓ نے نفی میں جواب دیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء سے فرمایا کہ: "جاؤ اور ان عورتوں سے کہہ دو کہ: "انَّ حُسنَ تَبَعُّلِ احدا کُنَّ لِزَوْجِہا، وَطَلَبِہا لِمَرْضَاتِہٖ، وَاِتِّبَاعِہا لِمُوافقتِہٖ، یَعْدِلُ کلَّ مَاذَکَرتِ لِلرِّجَالِ"۔(۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ عظیم خوش خبری سن کر حضرت اسماء کا دل بلّیوں اچھلنے لگا اور تکبیر وتہلیل کہتی ہوئی واپس ہوگئیں اور دیگر عورتوں کو بھی جاکر سنایا۔

تاریخ اسلامی کی ان چند جھلکیوں سے بہ خوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں کے اندر حصولِ علم کے تئیں کس قدر شوق اور جذبۂ بے پایاں پایا جاتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے شوقِ طلب اور ذوقِ جستجو کی قدر کرتے ہوئے، ان کی تعلیم وتربیت کا کتنا اہتمام فرماتے تھے۔

تعلیم وتربیت کے عمومی ماحول کا اثر

تعلیم وتربیت کے اسی عمومی ماحول کا اثر ہے کہ جماعتِ صحابیاتؓ میں بلند پایہ اہل علم خواتین کے ذکرِ جمیل سے آج تاریخ اسلام کا ورق ورق درخشاں وتاباں ہے؛ چنانچہ یہ امر محقق ہے کہ امہات المومنین میں حضرت عائشہؓ وحضرت ام سلمہؓ فقہ وحدیث وتفسیر میں رتبۂ بلند رکھنے کے ساتھ ساتھ

تحقیق ودرایت کے میدان کی بھی شہہ سوار تھیں، حضرت ام سلمہؓ کی صاحبزادی زینب بنت ابو سلمہؓ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پروردہ تھیں، ان کے بارے میں تاریخ کا بیان ہے کہ:

"کَانَتْ أَفْقَهَ نَسَاءِ أَهْلِ زَمَانِهَا" (٦)

حضرت ام الدرداء الکبریٰؓ اعلیٰ درجے کی فقیہ اور عالمہ صحابیہ تھیں۔(٧)

حضرت سمرہ بنت نہیک اسدیہؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ: "وہ زبردست عالمہ تھیں، عمر دراز پائیں، بازاروں میں جاکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرتی تھیں اور لوگوں کو ان کی بے راہ روی پر کوڑوں سے مارتی تھیں۔" (٨)

پھر یہ زریں سلسلہ دورِ صحابیات تک ہی محدود نہیں رہا؛ بلکہ تابعیات اور بعد کی خواتین کے زمانوں میں بھی ہمیں اس طبقے میں بڑی بڑی عالمہ، زاہدہ اور امت کی محسنہ وباکمال خواتین ملتی ہیں؛ چنانچہ مشہور تابعی، حدیث اور فن تعبیر الرؤیا کے مستند امام حضرت محمد بن سیرینؒ کی بہن حفصہؒ نے صرف بارہ سال کی عمر میں قرآنِ کریم کو معنی ومفہوم کے ساتھ حفظ کرلیا تھا(٩) یہ فن تجوید وقراءت میں مقامِ امامت کو پہنچی ہوئی تھیں؛ چنانچہ حضرت ابن سیرینؒ کو جب تجوید کے کسی مسئلے میں شبہ ہوتا، تو شاگردوں کو اپنی بہن سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے۔(١٠)

نفیسہؒ جو حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب کی صاحبزادی اور حضرت اسحاق بن جعفرؒ کی اہلیہ تھیں، انھیں تفسیر وحدیث کے علاوہ دیگر علوم میں بھی درک حاصل تھا، ان کے علم سے خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کی بھی معتدبہ تعداد نے سیر ابی حاصل کی، ان کا لقب "نفیسۃ العلم والمعرفہ" پڑ گیا تھا، حضرت امام شافعیؒ جیسے رفیع القدر اہل علم دینی مسائل پر ان سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔(١١)

اف! یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم

مذکورہ حقائق سے یہ بات توالم نشرح ہوجاتی ہے کہ اسلام جس طرح صنفِ لطیف کو دیگر حقوق بخشنے میں بالکل عادلانہ؛ بلکہ فیاضانہ مزاج رکھتا ہے، ویسے ہی اس کے تعلیمی حقوق کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے؛ بلکہ عملی سطح پر انھیں عطا کرنے کا بھی حد سے زیادہ اہتمام کرتا ہے۔

لیکن جہاں تک بات ہے خواتین کے موجودہ نظامِ تعلیم کی جسے(co-education)سے یاد کیا جاتاہے، جو مغرب سے درآمد (Import) کردہ ہے اور جو دراصل مغرب کی فکر گستاخ کا عکاس، خاتونِ مشرق کو لیلائے مغرب کی طرح ہوس پیشہ نگاہوں کی لذت اندوزی کا سامان بنانے کی ہمہ گیر اور گھناؤنی سازش اور اس کی چادرِ عصمت وعفت کو تار تار کرنے کی شیطانی چال ہے، اس کی مذہب اسلام تو کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا، نیز عقل دانا بھی اس سے پناہ مانگتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مخلوط تعلیم....ایک ہمہ گیر جائزہ

مخلوط تعلیم کے حوالے سے دو پہلو نہایت ہی توجہ اورانتہائی سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

۱- یہ کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا نصاب تعلیم ایک ہونا چاہیے یا جداگانہ؟

۲- لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہونی چاہیے یا الگ الگ؟ جہاں تک نصابِ تعلیم کی بات ہے، تو گرچہ کچھ امور ایسے ہیں، جو دونوں کے مابین مشترک ہیں اوران کا نصاب لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے یکساں رکھا جاسکتا ہے مثلاً: زبان وادب، تاریخ، معلوماتِ عامہ (General knowledge) جغرافیہ، ریاضی، جنرل سائنس اور سماجی علوم (Socialscience) وغیرہ؛ لیکن کچھ مضامین ایسے ہیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان فرق کرنا ہوگا، مثلاً: انجینئرنگ کے بہت سے شعبے، عسکری تعلیم، اور ٹیکنکل تعلیم؛ کیوں کہ ان کی لڑکیوں کو قطعاً ضرورت نہیں؛ البتہ میڈیکل تعلیم کا اچھا خاصا حصہ خواتین سے متعلق ہے؛ اس لیے "امراضِ نسواں" زمانے سے طب کا مستقل موضوع رہا ہے، یہ لڑکیوں کے لیے نہایت ضروری ہے، اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم میں امورِ خانہ داری کی تربیت بھی شامل ہونی چاہیے، کہ یہ ان کی معاشرتی زندگی میں انتہائی اہمیت رکھتے ہیں، سلائی، کڑھائی، پکوان کے مختلف اصول اور بچوں کی پرورش کے طریقے بھی ان کے نصابِ تعلیم کا حصہ ہونے چاہئیں، ان سے نہ صرف لڑکیاں گھریلو زندگی میں بہتر طور پر متوقع رول ادا کرسکتی ہیں؛ بلکہ ازدواجی زندگی کی خوش گواری، اہل خاندان کی ہردل عزیزی اور مشکل اور غیر متوقع صورتِ حال میں اپنی کفالت کے لیے یہ آج بھی بہترین وسائل ہیں، ساتھ ہی لڑکیوں کے لیے ان کے حسبِ حال آدابِ معاشرت کی تعلیم بھی ضروری ہے؛ کیوں کہ ایک

لڑکی اگر بہترین ماں اور فرماں بردار بیوی نہ بن سکے تو سماج کو اس سے کوئی فائدہ نہیں؛ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جیسا کہ ذکر ہوا) عورتوں کی تذکیر کے لیے علیحدہ دن مقرر فرمادیا تھا، جس میں عورتیں جمع ہوتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ان کے حسب حال نصیحت فرماتے؛ چنانچہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”خواتین کی دل بہلائی کا بہترین مشغلہ سوت کاتنا ہے۔“ (۱۲) کیوں کہ سوت کاتنا اس زمانے میں ایک گھریلو صنعت تھی؛ بلکہ آج سے نصف صدی پیشتر تک بھی بہت سے گھرانوں کا گزرانِ معیشت اسی پر تھا۔

غور کیجیے کہ جب قدرت نے مردوں اور عورتوں میں تخلیقی اعتبار سے فرق رکھا ہے، اعضاء کی ساخت میں فرق، رنگ وروپ میں فرق، قوائے جسمانی میں فرق، مزاج ومذاق، حتیٰ کہ دونوں کی پسند اور ناپسند میں بھی تفاوت ہے، پھر اسی طرح افزائشِ نسل اور اولاد کی تربیت میں بھی دونوں کے کردار مختلف ہیں، تو یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ معاشرے میں دونوں کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی الگ الگ نہ ہوں؟ اور جب دونوں کی ذمہ داریاں علیحدہ ٹھہریں، تو ضروری ہے کہ اسی نسبت سے دونوں کے تعلیمی وتربیتی مضامین بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں، اگر تعلیمی نصاب میں دونوں کے فطری اختلاف کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور تعلیم کے تمام شعبوں میں دونوں صنفوں کو ایک ہی قسم کے مضامین پڑھائے جائیں، تو جہاں یہ طریقۂ تعلیم انسانی معاشرے پر منفی اثر ڈالے گا، وہیں خود عورت کے عورت پن کے رخصت ہونے کا بھی انتہائی منحوس سبب ہوگا؛ لہٰذا صنفِ نازک کی فطری نزاکت کے لیے یہی زیب دیتا ہے کہ وہ وہی علوم حاصل کرے، جو اسے زمرۂ نسواں ہی میں رکھے اور اس کے فطری تشخص کی محافظت کرے، نہ کہ وہ ایسے علوم کی دل دادہ ہو جائے، جو اسے زن سے نازن بنادے۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ، لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ، وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا“ (۱۳) (اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک دوسرے کو جو فطری برتری عطا فرمائی ہے، اس کی تمنا مت کرو! مردوں کے لیے ان کے اعمال میں حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال میں اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل وکرم مانگتے رہو، بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے)

یہ آیت دراصل معاشرتی زندگی کے آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، اس میں یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ اللہ نے انسانی سماج کو اختلاف اور رنگارنگی پر پیدا کیا ہے، کسی بات میں مردوں کو فوقیت حاصل ہے، تو کسی معاملے میں وہ عورتوں کے تعاون کا دست نگر ہے، قدرت نے جو کام جس کے سپرد کیا ہے، اس کے لیے وہی بہتر اور اسی کو بجالانا اس کی خوش بختی ہے؛ کیوں کہ خالق سے بڑھ کر کوئی اور مخلوق کی ضرورت اور فطرت وصلاحیت سے واقف نہیں ہو سکتا، یہ مغربی ہوس کاروں کی خود غرضی اور دنائت ہے کہ انھوں نے عورتوں سے "حقِ مادری" بھی وصول کیا اور "فرائضِ پدری" کے ادا کرنے پر بھی ان بے چاریوں کو مجبور کیا، پھر جب انھوں نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ عورتوں پر لادنے کی ٹھان لی، تو ایسا نظامِ تعلیم وضع کیا، جس میں عورتوں کو مرد بنانے کی پوری صلاحیت موجود ہو، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خوب ارشاد فرمایا کہ: "تین افراد ایسے ہیں، جو کبھی جنت میں داخل نہ ہوں گے" اور ان تینوں میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "الرَّجُلَةُ مِنَ النِّسَاءِ" (۱۴) یعنی عورتوں میں سے مرد، دریافت کیا گیا: "عورتوں میں سے مرد سے کون لوگ مراد ہیں؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ عورتیں، جو مردوں کی مماثلت اختیار کریں" جیسا کہ بخاری کی روایت ہے: "وَالْمُتَشَبِّهَاتُ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ" (۱۵) علماء نے ایسی عورتوں کو جو مردوں والی تعلیم وتربیت اختیار کرتی ہیں اور پھر عملی زندگی میں مردوں کی ہم صف ہونا چاہتی ہیں، اسی وعید کا مصداق قرار دیا ہے۔

فرنگی نظامِ تعلیم پر اقبالؒ اور اکبرؒ کی تشویش

بیسویں صدی کے عظیم مفکر وفلسفی، سوزِ دروں سے سرشار، اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی کو واشگاف کرنے والے اور تاحیات حجازی لے میں نغمۂ ہندی گنگنانے والے شاعرِ اسلام، جو خود عصری تعلیم گاہ کے پرداختہ تھے اور مغربی نظامِ تعلیم کا انتہائی قریب سے اور عمیق مطالعہ کیا تھا، انھیں عورتوں کے حوالے سے مغرب کے پر فریب نعروں پر، جن کی صدائے بازگشت اسی وقت مشرق میں بھی سنی جانے لگی تھی، کافی بے چینی اور اضطراب تھا، ان کی نظر میں ان نعروں کا اصل مقصد یہ تھا کہ مشرقی خاتون کو بھی یورپی عورتوں کی طرح بے حیائی وعصمت باختگی پر مجبور کر دیا جائے اور مسلم قوم بھی مجموعی طور پر عیش کوشی وعریانیت کی بھینٹ چڑھ جائے اور مسلمانوں کی روایتی خصوصیات شجاعت ومردانگی، حمیت

وایثار، مروت اور خدا ترسی، مدہوشی کی حالت میں دم توڑ جائیں؛ تاکہ وہ یورپ کی غلامی کے شکنجے سے کبھی بھی رہائی نہ پاسکیں؛ اس لیے انھوں نے اپنی مثنوی "اسرار' و "رموز" "جاوید نامہ" "ارمغانِ حجاز" اور "ضربِ کلیم "میں متعدد مقامات پر مخلوط سوسائٹی اور مخلوط طریقۂ تعلیم کے تئیں انتہائی نفرت وبیزاری کا اظہار کیا ہے؛ چنانچہ "ضرب کلیم "میں کہتے ہیں:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم وہنر موت

اور تہذیب مغرب نے جس طرح عورت کو اس کے گھر سے زبردستی اٹھاکر بچوں سے دور کار گاہوں اور دفتروں میں لابٹھایا ہے، اس پر "خردمندانِ مغرب "کو اقبال یوں شرمندہ کرتے ہیں۔

کوئی پوچھے حکیمِ یورپ سے
ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار زن تہی آغوش

مغربی تعلیم نسواں کے حامی مشرق کے مستغربین کی روش پر اقبالؒ اپنے کرب وبے چینی کا اظہار یوں کرتے ہیں: "معاشرتی اصلاح کے نوجوان مبلغ یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تعلیم کے چند جرعے مسلم خواتین کے تنِ مردہ میں نئی جان ڈال دیں گے اور اپنی ردائے کہنہ کو پارہ پارہ کردیں گی، شاید یہ بات درست ہو؛ لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اپنے آپ کو برہنہ پاکر انھیں ایک مرتبہ پھر اپنا جسم ان نوجوان مبلغین کی نگاہوں سے چھپانا پڑے گا۔"(١٦)

بہ قول فقیر سید وحید الدین: "اقبالؒ زن و مرد کی ترقی، نشو و نما اور تعلیم وتربیت کے لیے جداگانہ میدانِ عمل کے قائل تھے، کہ اللہ نے جسمانی طور پر بھی دونوں کو مختلف بنایا ہے اور فرائض کے اعتبار سے بھی؛ چنانچہ موصوفِ محترم عورتوں کے لیے ان کی طبعی ضروریات کے مطابق الگ نظامِ تعلیم اور الگ نصاب چاہتے ہیں۔"(١٧)

”شذرات“ میں لکھتے ہیں: ”تعلیم بھی دیگر امور کی طرح قومی ضرورت کے تابع ہوتی ہے، ہمارے مقاصد کے پیش نظر مسلمان بچیوں کے لیے مذہبی تعلیم بالکل کافی ہے، ایسے تمام مضامین، جن میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے، احتیاط کے ساتھ تعلیم نسواں سے خارج کر دیے جائیں۔“(۱۸)

اسی سلسلہ میں ”ملفوظاتِ اقبال“ میں ان کا یہ قول ہے: ”مسلمانوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی؛ لیکن نہ دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے، یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے، جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دین بھی کھو رہی ہیں۔“(۱۹)

دراصل اقبالؒ کے نزدیک امتِ مسلمہ کے لیے قابلِ تقلید نمونہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ کا اسوہ ہے؛ چنانچہ اسی نسبت سے وہ خواتین کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی پیروی کریں اور اپنی آغوش میں ایسے نونہالوں کی پرورش کریں، جو بڑے ہو کر شبیر صفت ثابت ہوں، ”رموزِ بے خودی“ میں فرماتے ہیں:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول

مادراں را اسوۂ کامل بتول

اور ارمغانِ حجاز میں خواتین کو یوں نصیحت کرتے ہیں:

اگر پندے ز دُرویشے پذیری

ہزار امت بمیرد تو نہ میری

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر

کہ در آغوش شبیرے بگیری

(ایک دُرویش کی نصیحت کو آویزۂ گوش بنالو، تو ہزار قومیں ختم ہو سکتی ہیں؛ لیکن تم نہیں ختم ہو سکتیں، وہ نصیحت یہ ہے کہ بتول بن کر زمانے کی نگاہوں سے اوجھل (پردہ نشیں) ہو جاؤ؛ تاکہ تم اپنی آغوش میں ایک شبیر کو پال سکو)

دوسرے لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادیؒ ہیں، اقبالؒ کی طرح وہ بھی عصری تعلیم سے باخبر ہیں اور انھیں کی طرح ان کی بھی ساری فکری توانائی اور شاعرانہ صلاحیت و قوت کی تان تہذیب فرنگ کو

لتاڑنے اوراس کی زیاں کاریوں سے خبر دار کرنے پر ہی ٹوٹتی ہے، ان کی شاعری پوری تحریکِ مغربیت کے خلاف ردّ عمل ہے، ان کی شاعری بھی اقبالؒ کی طرح اول سے لے کر آخر تک اسی مادیت فرنگی کا جواب ہے اور ان کی ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانے پر لگتا ہے،بس دونوں میں فرق یہ ہے کہ اقبالؒ بہ راہِ راست تیشہ سنبھال کر تہذیب نو کو بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے نظر آتے ہیں، جبکہ حضرتِ اکبرؒ طنز کی پھلجھڑیوں کو واسطہ بنا کر مغرب کے مسموم افکار وخیالات پر پھبتیاں کستے ہیں۔

مغربی نظامِ تعلیم بھی حضرت اکبرؒ کا خاص موضوع تھا اوراس کی طرف خواتین کے روز افزوں بڑھتے ہوئے رجحانات سے بھی وہ بہت ملول اور کبیدہ خاطر تھے؛ چنانچہ ایک جگہ مغرب کی طرف سے اٹھنے والی تعلیمِ نسواں کی تحریک اور بے پردگی کولازم وملزوم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

مجلسِ نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو
پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

مشرق میں بہترین عورت کا تخیل یہ ہے کہ وہ شروع سے نیک سیرت، بااخلاق اور ہنس مکھ رہے، وہ جب بات کرے تو اس کے منھ سے پھول جھڑے، وہ دینی تعلیم حاصل کرے اور خانہ داری کے طور طریقے سیکھے، کہ آگے چل کر اس کو گھر کی ملکہ بننا ہے، بچپن میں والدین کی اطاعت اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانۂ جنت خیال کرے؛ تاکہ خانگی شیرازہ اس کی ذات سے بندھا رہے، خاندان کی مسرتیں اس کے دم سے قائم رہیں اور وہ صحیح معنی میں "گھر کی ملکہ" ثابت ہو، اس کے برخلاف فرنگیوں کے یہاں عزت کا معیار بدلا ہوا ہے، وہ عورت ہی کیا؟ جس کے حسن گفتار، حسن رفتار، حسن صورت، زیب وزینت، خوش لباسی، گلے بازی اور رقاصی کے چرچے سوسائٹی میں عام نہ ہوں، اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں، زبانوں پر جب اس کا نام آئے، توکام ودہن لذت اندوز ہوں، اس کا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کردے، اور اس کا تصور دلوں میں بے انتہا شوق، بہترین عورت وہ نہیں، جو بہترین بیوی اور بہترین ماں ہو؛ بلکہ وہ ہے، جس کی ذات دوست واحباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی ودل ربائی کے نقش ثبت ہوں کلب کے درودیوار پر، پارک کے سبزے زار پر، ہوٹلوں کے کوچ اور صوفوں پر، "ہمارے" اور "ان کے" تخیل کے اس بُعد المشرقین کو اقلیم لفظ و معنی کا یہ تاجدار دو مصرعوں میں جس جامعیت اور بلاغت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے، یہ اسی کا حصہ تھا:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بے گانہ تھی

اب ہے شمع انجمن، پہلے چراغِ خانہ تھی

"چمکی" میں وہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ لوٹ جائے اور یہ "چمک" مخصوص ہے "نئی روشنی" کی چمنیوں کے ساتھ۔

حسن وناز کی دنیا میں قابل داد و تحسین اب تک کم سخنی، کم گوئی اور بے زبانی تھی، مشرقی شوہر "چاند سی دلہن" اس لیے بیاہ کر لاتا تھا کہ وہ اسے اپنے گھر کا چراغ بنادے اور تخیل "خانہ آبادی" کا غالب رہتا، مگر مغربی نظامِ تعلیم کی دَین کہ محفل کے طور ہی کچھ اور ہو گئے، نقشہ بالکل ہی بدل گیا، اب تو ٹھاٹھ بزم آرائیوں کے جمے ہوئے، حجاب کی جگہ بے حجابی، سکوت کی جگہ طوفانِ تکلم، مستوری کی جگہ نمائش، عاشق بے چارہ اس کایاپلٹ پر دنگ، حیران، گم صم، کل تک جو نقش تصویر تھا، وہ آج گراموفون کی طرح مسلسل وقفِ تکلم۔

خامشی سے نہ تعلق ہے، نہ تمکین کا ذوق

اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں "اسپیچ" کا شوق

شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں

بت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

اکبر کے اسی مرقع کا ایک اور منظر۔

اعزاز بڑھ گیا ہے، آرام گھٹ گیا ہے

خدمت میں ہے وہ لیزی اور ناچنے کو ریڈی

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر

شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

ایک دوسری جگہ اس مرقع میں آب ورنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے:

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا

اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے ہال میں رقصاں

باقی جو تھے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا

بیرا وہ بنا کمپ میں، یہ بن گئیں آیا

بی بی نہ رہیں جب، تو میاں پن بھی سدھارا

دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ

"آغاز سے بدتر ہے سر انجام ہمارا"

یہ خیال نہ گزرے کہ اکبر سرے سے تعلیم نسواں کی مخالفت کرتے تھے اور لڑکیوں کو بالکل ہی ناخواندہ رکھنے کے حامی تھے، وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے؛ لیکن تعلیم تعلیم میں بھی تو زمین آسمان کا فرق ہے، وہ اس تعلیم کی تائید میں تھے، جو رابعہ بصریہ نہ سہی دورِ مغلیہ کی جہاں آراء بیگم ہی کے نمونے پیدا کرے، نہ کہ اس تعلیم کی، جو زینت ہوا پکچر پیلس اور نمائش گاہوں کی، اس تعلیم کو وہ رحمت نہیں، خدا کا قہر سمجھتے تھے، جس پر بنیادیں تعمیر ہوں ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کی، وہ آرزومند تھے، اس نظامِ تعلیم کے، جو مہربان مائیں، وفا سرشت بیویاں اور اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے، نہ کہ اس کے، جو تھیٹر میں ایکٹری اور برہنہ رقاصی کے کمالات کی طرف لے جائے، وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے تھے، کہ دنیا جنت نظیر بن جائے، وہ پریوں کے مشتاق نہ تھے، کہ ملک "راجہ اندر" کا اکھاڑا ہو کر رہ جائے ان کا قول تھا کہ:

دو شوہر و اطفال کی خاطر اسے تعلیم

قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مزید توضیح ملاحظہ ہو:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے، مگر

خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں، جو ہوں ان کے منتظم

استاذ ایسے ہوں، مگر "استاد جی" نہ ہوں

"استاذ اور استاد" کے لطیف فرق کو جس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ بس انہی کا حصہ ہے، استاذ تو دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت دینے والے کو کہتے ہیں، جبکہ استاد جی اربابِ نشاط کو تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں۔

ایک اور طویل نظم میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے اپنا پورا مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، چند اشعار نظر نواز ہوں:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہے، وہ بے شعور ہے
ایسی معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق، جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو وہ علم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ
عصیاں سے محترز ہو، خدا سے ڈرا کرے
اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

آگے حساب کتاب، نوشت وخواند، اصولِ حفظانِ صحت، کھانا پکانے اور کپڑے سینے وغیرہ کو درسِ نسوانی کا لازمی نصاب بتا کر فرماتے ہیں:

داتا نے دَھن دیا ہے، تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر کی دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز ورقص کا اسکول اور ہے
دنیا میں لذتیں ہیں، نمائش ہے، شان ہے
ان کی طلب میں، حرص میں سارا جہان ہے
اکبر سے یہ سنو! کہ یہ اس کا بیان ہے

دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا، تو ہے اس کا عمل خراب

آج اس کا خوش نما ہے، مگر ہو گا کل خراب (۲۰)

مخلوط تعلیم کا دوسرا پہلو

مخلوط تعلیم کا دوسرا پہلو لڑکو اور لڑکیوں کی مشترک تعلیم گاہ ہے، اس سلسلے میں یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ ابتدائی عمر، جس میں بچے صنفی جذبات سے عاری ہوتے ہیں اور ان میں ایسے احساسات پیدا نہیں ہوتے، مخلوط تعلیم کی گنجائش ہے اور آٹھ، نو سال کی عمر تک ابتدائی درجات کی تعلیم میں تعلیم گاہ کا اشتراک رکھا جاسکتا ہے؛ اسی لیے اسلام نے بے شعور بچوں کو غیر محرم عورتوں کے پاس آمد ورفت کی اجازت دی ہے اور قرآن مقدس نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے (۲۱)؛ لیکن جب بچوں میں جنسی شعور پیدا ہونے لگے اور ایک حد تک بھی (کلی طور پر نہ سہی) ان میں صنفی جذبات کی پہچان ہو جائے، تو ایک ساتھ ان کی تعلیم آگ اور بارود کو ایک جگہ جمع کرنے کی مانند ہے اور اس کا اعتراف (گو دیر سے سہی) آج یورپ وامریکہ کے بڑے بڑے ماہرین نفسیات (Psychology) وحیاتیاتِ بشری (Humanbiology) کررہے ہیں؛ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ عورت اور مرد میں کشش جنسی بالکل طبعی اور فطری ہے اور دونوں جب باہم ملیں گے اور کوئی مانع نہیں ہو گا، تو رگڑ سے یکبارگی بجلی کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔

اور اسلام کا نقطۂ نظر اس حوالے سے بالکل واضح، بے غبار، ٹھوس اور سخت ہے، کہ ایک مرد یا عورت کے لیے کسی غیر محرم کے ساتھ مل بیٹھنا کجا ایک دوسرے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی قطعاً گنجائش نہیں؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تاریخی سفر حج میں فضل بن عباسؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹنی پر سوار ہیں، قبیلہ "بنو خثعم" کی ایک لڑکی ایک شرعی مسئلے کی دریافت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور فضل بن عباسؓ کی نگاہ اچانک اس لڑکی پر پڑ جاتی ہے، تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ان کا رخ پھیر دیتے ہیں۔

جلیل القدر صحابی حضرت جریر بن عبد اللہ بجلیؓ فرماتے ہیں: "سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ عَنْ نَظْرِ الْفُجَائَۃِ فقال: "اِصْرِفْ بَصَرَکَ"۔ (۲۲)

حضرت علی بن ابی طالب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یَا عَلِیُ! لَا تُتْبِعِ النَّظْرَۃَ النَّظْرَۃَ؛ فَاِنَّ لَکَ الْاُوْلٰی، وَلَیْسَتْ لَکَ الْآخِرَۃ“ (۲۳)

مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعتی حکم جاری فرمایا: چنانچہ ایک دفعہ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ (بعض روایات کے مطابق حضرت عائشہؓ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھیں، اچانک حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم تشریف لے آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے فرمایا کہ ان سے پردہ کرو! تو حضرت ام سلمہؓ نے قدرے تحیر زدہ ہو کر کہا: ”یہ تو نابینا ہیں! نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں اور نا ہی پہچان سکتے ہیں“ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھ رہی ہو؟“ (۲۴)

پھر اسلام کا یہ نظریہ کسی خاص شعبۂ حیات سے متعلق نہیں؛ بلکہ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد سے تاحیات اس کا یہی حکم ہے؛ چنانچہ جب ہم اہلِ علم خواتینِ اسلام کی تاریخ اور ان کی تعلیم وتربیت کے طریقوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ میمون میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا غایت درجہ اہتمام فرماتے کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں اختلاط کی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے؛ تاکہ یہ شیطان کی طرف سے کسی غلط کاری کی تحریک کا باعث نہ ہو؛ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کی صف سے نکلے اور حضرت بلالؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز عورتوں تک نہیں پہنچی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی صف تک تشریف لے گئے، انھیں نصیحت فرمائی اور صدقہ کرنے کا حکم دیا، تو کوئی عورت اپنی بالی پھینکنے لگی اور کوئی انگوٹھی اور حضرت بلالؓ اپنی چادر میں انھیں سمیٹنے لگے۔“ (۲۵)

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں اور عورتوں کو خلط ملط دیکھا، تو عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”پیچھے ہٹ جاؤ! تمہارا بیچ راستے پر چلنا مناسب نہیں لبِ راہ چلا کرو“۔ (۲۶)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے ادوار میں بھی عورتوں کی تعلیم وتربیت کے تعلق سے عدمِ اختلاط کا خصوصی اہتمام رہا؛ چنانچہ حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ قرنِ اوّل اور اس کے بعد طالبات کے تعلیمی اسفار اور ان کے طریقۂ تعلیم وتربیت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ”عام طور

سے ان تعلیمی اسفار میں طالبات کی صنفی حیثیت کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا اور ان کی راحت و حفاظت کا پورا اہتمام ہوتا تھا، خاندان اور رشتہ کے ذمہ دار اُن کے ساتھ ہوتے تھے، امام سہمیؒ نے "تاریخ جرجان" میں فاطمہ بنت ابی عبد اللہ محمد بن عبد الرحمن طلقی جرجانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ: "میں نے فاطمہ کو اس زمانے میں دیکھا ہے، جب ان کے والد ان کو اٹھا کر امام ابو احمد بن عدی جرجانی کی خدمت میں لے جاتے تھے اور وہ ان سے حدیث کا سماع کرتی تھیں، فاطمہ بنت محمد بن علی لخمیہؒ اندلس کے مشہور محدث ابو محمد باجی اشبیلیؒ کی بہن تھیں، انھوں نے اپنے بھائی ابو محمد باجیؒ کے ساتھ رہ کر طالب علمی کی اور دونوں نے ایک ساتھ بعض شیوخ واساتذہ سے اجازتِ حدیث حاصل کی۔"(۲۷)

آگے لکھتے ہیں: "ان محدثات وطالبات کی درس گاہوں میں مخصوص جگہ ہوتی تھی، جس میں وہ مردوں سے الگ رہ کر سماع کرتی تھیں اور طلبہ وطالبات میں اختلاط نہیں ہوتا تھا۔"(۲۸)

ان تصریحات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جہاں عورتوں کو تعلیم وتربیت کے حصول کی پوری آزادی بخشی ہے، وہیں اس کے نزدیک مرد وعورت کے درمیان اختلاط کی کوئی گنجائش نہیں؛ بلکہ دونوں کے لیے علیحدہ تعلیم گاہ ہونی چاہیے، جہاں وہ یک سوئی اور سکونِ خاطر کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں، اور ہر نوع کے ممکن فتنے کا سدِّ باب ہو سکے، خاص طور سے موجودہ دور میں، جب کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب مخلوط تعلیم کی فحش کاریاں اور زیاں کاریاں ظاہر وباہر ہو چکی ہیں اور خود یورپ وامریکہ کی تعلیم گاہوں کے ماہرینِ تعلیم وسماجیات وعمرانیات کی رپورٹس اس کا بین ثبوت ہیں؛ چنانچہ مشہور فرانسیسی عالم عمرانیات "پول بیورو"(Poulbureou) اپنی کتاب (Towardsmoral Bankruptcy) میں لکھتا ہے کہ: "فرانس کے متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ لڑکیاں، جو کسی فرم میں کام کرتی ہیں اور سائستہ سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتی ہیں، ان کے لیے کسی اجنبی لڑکے سے مانوس ہو جانا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے، اوّل اوّل اس طرزِ معاشرت کو معیوب سمجھا گیا، مگر اب یہ اونچے طبقے میں بھی عام ہو گیا ہے اور اجتماعی زندگی میں اس نے وہی جگہ حاصل کر لی ہے، جو کبھی نکاح کی تھی۔"(۲۹)

امریکہ کی تعلیم گاہوں کے نوجوان طبقہ کے بارے میں جج بن لنڈسے (Benlindsey) جس کو ڈنور (Denver) کی عدالت جرائم اطفال (Juentlecourt) کا صدر ہونے کی حیثیت سے امریکہ کے نوجوانوں کی حالت سے واقف ہونے کا بہت زیادہ موقع ملا، اپنی کتاب (Revolt of Modern

youth) میں لکھتا ہے کہ: "امریکہ میں ہائی اسکول کی کم از کم ۴۵ فیصد لڑکیاں اسکول سے الگ ہونے سے پہلے خراب ہو چکتی ہیں اور بعد کے تعلیمی مدارج میں اوسط اس سے کہیں زیادہ ہے، لڑکیاں خود ان لڑکوں سے اس چیز کے لیے اصرار کرتی ہیں، جن کے ساتھ وتفریحی مشاغل کے لیے جاتی ہیں اور اس قسم کے ہیجانات کی طلب ان میں لڑکوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں، گرچہ زنانہ فطرت ان اقدامات پر فریب کاری کے پردے ڈالتی ہے۔"(۳۰)

انگلینڈ کے مرکزی شہر لندن (جو تہذیب جدید کا صاف شفاف آئینہ ہے، اسی آئینے میں اس کی تمام تر گل کاریوں کا عکسِ قبیح نظر آتا ہے) کی "غیر شادی شدہ ماؤں اور ان کے بچوں کی نویں کونسل" سے خطاب کرتے ہوئے انگلینڈ کی مشہور مصنفہ "مس مار گانتا لاسکی" یہ دھماکہ خیز انکشاف کرتی ہے کہ: "انگلستان کی تقریباً ۷۰ فیصد لڑکیاں شادی سے قبل ہی اپنے دوستوں سے جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہیں اور ۳۳ فیصد لڑکیاں شادی سے قبل ہی حاملہ ہو جاتی ہیں۔"(۳۱)

لندن کے ایک سماجی کارکن نے اپنی مطالعاتی رپورٹ میں وہاں کی مخلوط تعلیم گاہوں کی صنفی آوارگی اور جنسی انارکی (Anarchy) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "اسکول میں آج کل چودہ برس کے لڑکے اور لڑکیاں عام طور پر مانعِ حمل اشیاء اپنے اپنے بیگ میں لیے پھرتے ہیں کہ جانے کب کہاں ضرورت پڑ جائے؟ اس معاملے میں وہ اپنے ماں باپ سے کہیں زیادہ ہوشیار ہیں۔"(۳۲)

خیر! یہ تو نافِ تمدن اور مرکز تہذیب کی بات ہے، خود مشرق میں بھی (جس کے رگ وپے میں گویا خوانِ مغرب کی زلہ خواری سرایت کر چکی ہے اور مغرب کی "عطا کردہ" ہر "نعمت غیر مترقبہ" کا والہانہ استقبال کرنا اور اسے ہاتھوں ہاتھ لینا اس کی جبلت بن چکا ہے اور جس کے فرزندوں میں مستغربین کی ٹولی کی ٹولی جنم لے رہی ہے) مخلوط تعلیم کے انتہائی مضرت رساں نتائج مشاہدے میں آرہے ہیں؛ بلکہ صورتِ حال تو یہ ہو چکی ہے کہ۔

مے خانہ نے رنگ وروپ بدلا ایسا
مے کش مے کش رہا، نہ ساقی ساقی

غور کیجیے کہ مخلوط تعلیم گاہوں میں جہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ایک ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہوں، پھر دونوں کی نشست گاہیں بھی ایک ساتھ ہوں اور ان سب پر طرفہ یہ کہ عریاں ونیم عریاں بازو،

لب ہائے گلگوں، جمکتے ہوئے عارض، چشم ہائے نیم باز، بکھری ہوئی زلفیں؛ بلکہ سارا سراپا "انا البرق" کا منظر پیش کررہا ہو، تو کیا فریق مقابل اپنے ذوقِ دید اور شوقِ نظارہ کو صبر وشکیبائی کا رہین رکھے گا یا بے تابانہ اپنی نگاہوں کی تشنگی دور کرنے کی سوچے گا؟ پھر جب جمالِ جہاں آراپوری تابانیوں کے ساتھ دعوتِ نظارہ دے رہا ہو، تو اس کی دید کی پیاس بجھے گی کیوں؟ وہ تو اور تیز تر ہو جائے گی اور جام پر جام چڑھائے جانے کے باوصف اس کا شوقِ دیدار "ہَل مِن مَزِید" کی صدائے مسلسل لگائے گا۔

ساقی جو دیے جائے یہ کہہ کر کہ پیے جا

تو میں بھی پیے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیے جا

اور شیطان ایسے موقعوں پر کبھی نہیں چوکتا، جب اس کا شکار پوری طرح اس کے قبضے میں آجائے؛ چنانچہ معاملہ صرف دید ہی تک محدود رہ جائے، یہ ناممکن ہے، اس سے بھی آگے بڑھ کر گفت وشنید تک پہنچتا ہے، پھر بوس وکنار اور ہم آغوش ہونے اور بالآخر وہاں تک پہنچ کر دم لیتا ہے، جس کے بیان سے ناطقہ سر بہ گریباں اور خامہ انگشت بہ دنداں ہے اور اس قسم کے حادثات کوئی ضروری نہیں کہ یونیورسٹیز اور کالجز کے احاطوں ہی میں رونما ہوں؛ بلکہ رسل ورسائل اور آئے دن کے مشاہدات یہ ثابت کرتے ہیں کہ کالجز کے کلاس روم، شہروں کے پارک اور پبلک مقامات تک کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ #

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

پس چہ باید کرد؟

ایسے پر آشوب اور ہلاکت خیز ماحول میں بھی اگر ہوش کے ناخن نہ لیے گئے، اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی "مُثقّف" اور "روشن خیال" بنانے کا مخلوط طریقہ کاریوں ہی برقرار رہا، تو ہر نیا طلوع ہونے والا سورج بنتِ حوا کی عزت وناموس کی پامالی کی خبر نو لے کر آئے گا اور پھر دنیا بہ چشم عبرت نگاہ دیکھے گی کہ وہ مقامات، جو انسان کو تہذیب وشائستگی اور انسانیت کا درس دینے، قوم ووطن کے جاں سپار خادم اور معاشرے کے معزز وکامیاب افراد تیار کرنے کے لیے منتخب کیے گئے تھے؛ محض حیوانیت وبہیمیت اور شہوت رانی وہوس کاری کے اڈے بن کر رہ گئے۔ (لا قدّر اللہ ذلک)

خواتین کو تعلیم دی جائے، اسلام قطعاً اس کی مخالفت نہیں کرتا؛ بلکہ وہ تو اس کی حد درجہ تاکید کرتا ہے، جیسا کہ ماقبل میں بتایا گیا؛ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ان کی تعلیم وہی ہو، جو ان کی فطرت، ان کی لیاقت اور ان کی قوتِ فکر وادراک کے مناسب ہو اور ان کی عفت کی حفاظت میں مدد ومعاون ہو، نہ کہ ایسی تعلیم، جو انھیں زمرۂ نسواں ہی سے خارج کر دے اور شیاطینُ الانس کی درندگی کی بھینٹ چڑھا دے، اللہ تعالیٰ سود وزیاں کی صحیح فہم کی توفیق بخشے۔ (آمین)

***

حواشی

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امتہ واہلہ، ج:۱، ص:۲۰، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا الخ، ج:۱، ص:۸۶۔

(۲) مرقات، ملا علی قاریؒ، ج:۱، ص:۷۹۔

(۳) فتوح البلدان، بلاذریؒ، ج:۱، ص:۴۵۸۔

(۴) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ہل یجعل للنساء یوما علی حدۃ فی العلم ج:۱، ص:۵۷۔

(۵) الاستیعاب، ابن عبد البرؒ، ج:۲، ص:۷۲۶۔

(۶) الاستیعاب، ابن عبد البرؒ، ج:۲، ص:۷۵۶۔

(۷) تہذیب التہذیب، ابن حجر عسقلانیؒ ج:۱۱، ص:۴۰۹۔

(۸) الاستیعاب، ابن عبد البرؒ، ج:۲، ص:۷۶۰۔

(۹) تہذیب التہذیب، ابن حجر عسقلانیؒ، ج:۱۱، ص:۴۰۹۔

(۱۰) صفۃ الصفوہ، ابو الفرج عبد الرحمن ابن الجوزیؒ، ج:۴، ص:۱۶۔

(۱۱) تاریخ اسلام کی چار سو باکمال خواتین، طالب الہاشمی ص:۱۲۳-۱۲۲۔

(۱۲) کنزل العمال، باب اللہو واللعب والغنی، حدیث:۴۰۶۱۱۔

(۱۳) سورۂ نساء آیت:۳۲۔

(۱۴) مجمع الزوائد، نور الدین ہیثمیؒ، ج:۴، ص:۳۲۷۔

(۱۵) صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب المتشبہین بالنساء والمتشبہات بالرجال، ج:۲، ص:۸۷۴۔

(۱۶) شذراتِ فکر اقبال، علامہ اقبالؒ، ص:۱۴۷۔

(۱۷) روز گارِ فقیر، ج:۱، ص:۱۶۶۔

(۱۸) ص:۸۵۔

(۱۹) ص:۲۰۸۔

(۲۰) اکبر نامہ، عبدالماجد دریابادیؒ، ص: ۱۰۷-۱۰۵ ، و ۱۱۳-۱۱۰ ملخصاً۔

(۲۱) النور آیت: ۵۸۔

(۲۲) سنن ابی داوٗد، کتاب النکاح، باب مایؤمر من غض البصر، ج:۱، ص:۲۹۲، صحیح مسلم، کتاب الآدب، باب نظر الفجاءۃ، ج:۲، ص:۲۱۲۔

(۲۳) سنن ابی داوٗد، کتاب النکاح، باب مایؤمر من غض البصر، ج:۱، ص:۲۹۲۔

(۲۴) سنن ترمذی، ابواب الاستیذان والآدب، باب ما جاء فی احتجاب النساء من الرجال، ج:۲، ص:۱۰۶۔

(۲۵) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب عظۃ النساء وتعلیمہن، ج:۱، ص:۲۰۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ العیدین، فصل فی الصلوۃ قبل الخطبۃ، ج:۱، ص:۲۸۹۔

(۲۶) سنن ابی داوٗد، کتاب الآدب، باب فی مشی النساء فی الطریق، ج:۲، ص:۷۱۴۔

(۲۷) خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات، قاضی اطہر مبارک پوریؒ، ص:۲۳، تاریخ جرجان، امام سہمی، ص:۴۶۳۔

(۲۸) خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات، قاضی اطہر مبارک پوریؒ، ص:۳۳۔

(۲۹) پردہ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص:۵۴۔

(۳۰) فریب تمدن، اکرام اللہ ایم اے، ص:۱۵۸، افکارِ عالم، اسیر ادروی، ج:۱، ص:۲۲۶۔

(۳۱) صدقِ جدید، عبدالماجد دریابادیؒ، ۲۶/ دسمبر ۱۹۶۰/، فریب تمدن، اکرام اللہ ایم اے، ص:۱۸۷، افکارِ عالم، اسیر ادروی ج:۱، ص:۲۲۸۔

(۳۲) صدق جدید، عبد الماجد دریابادیؒ، ۶/ جنوری ۱۹۵۶/، فریب تمدن، اکرام اللہ ایم اے، ص:۱۸۹، افکارِ عالم، اسیر ادروی، ج:۱، ص:۲۲۹۔

تعلیم نسواں کی اہمیت

دنیا میں زر، زمین اور زن کو وجہ فساد قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ مرد کی ہوسِ زر، زمینوں کے جھگڑے اور عورتوں کی تعلیم و تربیت سے بے توجہی کا نتیجہ ہے کہ معاشرے میں فساد پھیلتا ہے، مرد ہی دنیا کا اصل حاکم ہے اور اس کی مرضی کے مطابق دنیا چل رہی ہے۔ اس لیے جو شر و فساد دنیا میں ہے اس کا ذمہ دار مرد ہے، عورت نہیں۔ عورت تو گھر بناتی ہے۔ اپنا گھر بگاڑنے والی عورتیں کم ہی ہیں۔ عورت کا بنایا ہوا گھر معاشرتی اقدار کے لحاظ سے ہمارا مضبوط قلعہ ہے، اور یہ گھروں کی تہذیب ہی ہے جس کی وجہ سے اچھی اقدار ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی ہیں، اور عورت جو قلعہ بناتی ہے اس کے مقابلے کے لیے اس میں سخت جانی بھی ہوتی ہے اور گھر سے باہر کی دنیا کے برے اثرات گھروں میں آسانی سے راہ نہیں پاتے۔ لیکن زمانۂ جدید نے "میڈیا" کا نیا سرطان پیدا کیا ہے جو ہر گھر میں موجود ہے اور اخبارات، رسائل، ٹی وی گھروں کا حصہ بن کر گھرانوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں اور ہماری اقدار کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک بڑا چیلنج ہے اور ہمارے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف تو پرائیویٹ ٹی وی کی اجازت دینے پر بھی غور کر رہے ہیں جبکہ سرکاری ٹی وی پہلے ہی اخلاقیات پر حملہ آور ہے، پرائیویٹ ٹی وی تو اس سے کہیں آگے جائیں گے۔ اور پاکستان میں پرائیویٹ ٹی وی نہ ہوں تب بھی بیرونی ٹی وی ہمارے گھروں میں رسائی پا چکے ہیں اور عورتوں، لڑکیوں، بچے، بچیوں کے ذہنوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ اس نئی مصیبت کے مقابلے کے لیے تنہا مرد کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ اپنے گھر میں ٹی وی نہ رکھیں تو گھر کی عورتیں اور بچے پاس پڑوس کے گھروں میں جا کر ٹی وی کے حیا سوز پروگرام دیکھا کریں گے۔ اخبارات میں عورتوں کی رنگین تصویریں تو ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں کے رنگ اور ان کے ڈھنگ بھی خیالات و جذبات میں ہلچل پیدا کرتے ہیں، خاص طور پر کم عمر لڑکیوں پر ان کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم نے تعلیمِ نسواں کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ مرد حضرات مرد کی حکمرانی پر تو زور دیتے رہے اور حقِ حکمرانی کو جائز ناجائز طریقے سے استعمال کیا، لیکن یہ بہت کم سوچا گیا کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بھی مرد کی کچھ ذمہ داری ہے۔ اگر مغرب نے عورت کو بازار کی جنس بنا دیا تو ہم اہلِ مشرق

نے عورت کو گھر کی لونڈی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اب زمانہ ترقی کر گیا ہے تو نئی نسل کے نوجوان پہلے کی طرح گھروں میں درشت مزاج آقا نہیں رہے لیکن وہ زن مرید بن کر رہ گئے ہیں۔ جہاں تک عورتوں کی تعلیم کا تعلق ہے ماضی میں اس کو غیر ضروری سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ سر سید بھی عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔ انہوں نے ایک مضمون میں لکھا کہ لڑکیوں کا اسکول جانا مناسب نہیں ہے، وہاں وہ طرح طرح کی لڑکیوں سے جن میں غیر مذاہب کی لڑکیاں بھی شامل ہیں، میل جول رکھیں گی، اس طرح ان پر گھر کے باہر کی بری دنیا کا اثر ہو گا۔ خدا بھلا کرے راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کا کہ وہ بہت قدامت پسند تھے، لیکن انہوں نے تعلیم نسواں کے لیے زبردست تحریک چلائی اور عورتوں کے پڑھنے لکھنے کے لیے بڑا لٹریچر بھی تیار کیا، ان میں "عصمت" رسالے کا نام آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

یہ زمانہ گزر گیا، اب تعلیم نسواں کے لیے کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہے، لڑکیوں میں بھی پڑھنے کا شوق ہے اور ماں باپ بھی چاہتے ہیں کہ کچھ نہیں تو بچی میٹرک، ایف اے ضرور ہو۔ اور یونیورسٹیوں میں اب لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں نظر آ رہی ہیں۔ امتحانات کے نتائج بتاتے ہیں کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتی ہیں۔ مگر اس تعلیم سے معاشرے کا اصل مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی اُلجھ گیا ہے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ عورت، جس نے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے، بناؤ سنگھار اور آرائش و زیبائش ہی کے چکر میں نہ رہے۔ معاشرتی اصلاح کی تحریک اگر تنہا مرد چلائیں گے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس تحریک میں عورتوں کا بھی آگے آنا ضروری ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم عورتوں کو حقیر مخلوق خیال نہ کریں، انہیں عزت دیں، ان کو اپنے برابر کا سمجھ کر ان سے حالاتِ حاضرہ اور مسائلِ جدیدہ پر گفتگو کریں، ان کی بھی سنیں، اپنی بھی سنائیں۔ اگر عورتوں کی ذہنی سطح بلند نہیں ہو گی اور وہ صرف باورچی خانے کی ضرورت کی چیز سمجھی جائیں گی، یا انہیں صرف بچے پیدا کرنے اور نہ پیدا کرنے کے لیے برتھ کنٹرول کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے گا تو معاشرہ ترقی نہیں کر سکے گا۔ اس ترقی اور اصلاح کے لیے عورتوں کو گھر کی محدود دنیا سے باہر قدم رکھ کر اپنا کردار ادا کرنا ہو گا، اور یہ سب کچھ حجاب کی پابندی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، پردہ اس میں کہیں بھی رکاوٹ نہیں، اور اسلامی پردہ وہ ہے بھی نہیں جو رائج ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ "کیا میں تمہیں ایسے خزانے سے مطلع نہ

کروں جو سب سے اچھا ہے، سن لو کہ وہ نیک عورت ہے"۔ ایک اور حدیث ہے کہ "دنیا سامانِ زینت ہے اور اس کی بہترین متاع صالح عورت ہے"۔ عورت کی اس نیکی کے لیے زمانے میں زیادہ خطرات نہیں تھے، جب وہ گھر کی چار دیواری میں بند تھی اور باہر کی دنیا اس کے گھر میں بہت کم داخل ہو سکتی تھی۔ اب یہ پرانا طرز چل نہیں سکتا۔ عورتیں بازار بھی جائیں گی، محفلوں میں بھی ان کا مردوں سے آمنا سامنا ہو گا اور کہیں ملازمت بھی ان کی ضرورت ہو گی، اور کچھ نہ ہو تو ذرائع ابلاغ عورتوں پر اپنا اثر ڈالیں گے۔ اس لیے آج پہلے کے مقابلے میں عورتوں کے حوالے سے کہیں زیادہ بڑی تحریک کی ضرورت ہے، اور عورتوں کو ہم اپنی اصلاحی تحریکوں سے الگ رکھیں گے تو یہ بڑی غلطی ہو گی، کیونکہ گھر مرد نہیں، عورتیں بناتی ہیں اور گھر صحیح بنتے ہیں تو معاشرہ بھی صحیح ہوتا ہے۔ اس لیے عورتوں کی ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ کسی زمانے میں اس ذہنیت کا اظہار اس حدیثِ نبویؐ میں کیا گیا تھا کہ عورتوں کو سونے کی سرخی اور زعفران کی زردی نے ہلاک کر رکھا ہے۔ لیکن آج نسوانیت کی ہلاکت کے اور بھی بہت سے سامان ہو گئے ہیں اور اب عورت معاشرے میں غیر فعال، غیر موثر عنصر کے طور پر نہیں رہ سکتی۔ وہ یا تو برائی کے راستے پر جائے گی یا بھلائی کی راہ اپنائے گی۔ اور برائی کے راستے پر جانے کے لیے کسی شعور اور ارادے کی ضرورت نہیں ہے۔ معاشرے کا چلن خود بخود اس راہ میں اسے دھکے دے کر آگے بڑھاتا رہے گا، لیکن نیکی کے راستے کو اپنانے کے لیے پختہ شعور اور عزم کی ضرورت ہو گی۔ یہ شعور اور عزم خواتین بھی اپنے میں پیدا کریں اور مرد حضرات بھی اس کی ضرورت محسوس کریں۔

(شائع شدہ 19 نومبر 1999ء)

ایک کامیاب معاشرے کیلئے تعلیم نسواں ضروری ہے

''تعلیم نسواں'' دو الفاظ کا مرکب ہے، تعلیم اور نسواں۔ تعلیم کا مطلب ہے ''علم حاصل کرنا''۔ نسواں ''نسا'' سے ہے جس کا مطلب ہے عورتیں۔ گویا تعلیم نسواں سے مراد عورتوں کی تعلیم ہے۔ علم اور تعلیم دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔

تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تخلیق فرما کر جنت میں ٹھہرایا۔ حضرت آدمؑ نے تمام نعمتوں کے موجود ہونے کے باوجود تنہائی و کمی محسوس کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت حواؑ کو پیدا فرمایا۔ گویا عورت کا وجود کائنات کی تکمیل کرتا ہے۔

عورت اس کائنات کا جمال و شاہکار اور دلکش وجود ہے۔ وہ گردش لیل و نہار کا ایک حسین اور کیف آور نغمہ ہے جس کے دم سے حیات قائم ہے۔ عورت کے بغیر انسانی نسل کا استحکام اور نشو و نما ناممکن ہے۔ بقائے حیات و معاشرے کا قیام و استحکام، جسمانی و روحانی آسودگی عورت ہی کے باعث ہے۔ عورت ماں کے روپ میں بے لوث محبت و شفقت و ہمدردی اور ایثار و قربانی کی انمول داستان ہے۔ عورت بیوی کی صورت میں خلوص، وفاداری اور چاہت کا حسین افسانہ ہے۔ عورت بہن کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمت ہے تو بیٹی کے روپ میں خدا کی رحمت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت انسانیت کی عزت ہے۔ مذہب اسلام نے عورت کو مرد کے برابر مقام و مرتبہ عطا فرما کر اس کی حیثیت متعین کر دی ہے بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اسلام نے عورت کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر فوق الثریٰ تک پہنچادیا ہے۔

علم دلکش داستان اور بے مثال کہانی ہے۔ یہ لا محدود موضوع ہے۔ ایک جامع مضمون ہے جو ہر شے کے ہر پہلو کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ وہی طاقت و قوت ہے جس نے دربار خداوندی میں انسان کی فضیلت فرشتوں پر ثابت کی ہے۔ علم ایک لازوال دولت ہے جو تقسیم کرنے سے کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جو جہالت کی تاریکی کو مٹاتی ہے۔ یہ وہ زرخیز زمین ہے جس کے پھولوں اور پھلوں کی کوئی گنتی، کوئی شمار نہیں۔ یہ وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو انسان کو خود شناسی اور خدا شناسی سکھاتی ہے۔

علم کا عمل تعلیم سے مکمل ہوتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے ایک نسل اپنا تہذیبی اور تمدنی ورثہ دوسری نسل کو منتقل کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ہر سوسائٹی اپنے تہذیبی مسائل اور تمدنی حالات کے مطابق ادارے

قائم کرتی ہے اور ہر ادارے کی اپنی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ وہ قوم اور ملک کی توقعات پر پورا اترے۔ لیکن ایک چیز سب میں مشترک ہے کہ پچھلی نسل اگلی نسل کو اپنے سارے تجربات منتقل کرتی ہے بلکہ یہی نہیں پوری انسانیت کے تجربات اور علوم پوری طرح منتقل کرتی ہے تا کہ اقوام عالم کے شانہ بشانہ زندگی کی دوڑ میں شریک ہوا جاسکے۔

مذہب اسلام کو دیگر مذاہب کے مقابلے میں ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ یہ حصول علم پر ہر ممکن زور دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں تقریباً پانچ سو کے لگ بھگ مقامات پر بلاواسطہ یا بالواسطہ حصول علم کی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔ پھر یہ مذہب مرد کی طرح عورت کے لئے بھی تعلیم کا حصول لازم قرار دیتا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ. (صحیح بخاری) ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن حکیم میں اس دعا کی ہدایت فرمائی گئی ہے: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا. (طٰہٰ:۱۱۴) ''اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔'' یوں گویا بالواسطہ طور پر مسلمانوں کو حصول علم کی رغبت و تعلیم دی گئی ہے۔ ایک اور مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم و حکمت کو مومن کی گمشدہ متاع قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی مخصوص فرما رکھا تھا۔ ازواج مطہرات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دین کی باتیں سیکھ کر دیگر مسلمان خواتین کو سکھاتی تھیں۔ یوں دین کی تعلیم عورتوں تک بھی باقاعدہ پہنچتی رہی۔

بدقسمتی سے اسلامی تعلیمات کی ادھوری تفہیم اور انہی معاشرتی رسوم و رواج میں خلط ملط کرنے کے باعث خواتین کو ماضی میں علوم کے ذرائع تک آزادانہ رسائی کا حق حاصل نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے وہ نسل در نسل زیور تعلیم سے محروم رہیں۔ اور اگر انہیں گھر میں بھی دین کی تعلیم دی گئی تو وہ بھی اس معیار کی نہ تھی جس سے دین اسلام کا صحیح مفہوم انہیں معلوم ہو سکے اور وہ نئی نسل کی تربیت صحیح انداز میں کر سکیں۔ درحقیقت تعلیم ہی وہ زیور ہے جس سے عورت اپنے مقام سے آگاہ ہو کر اپنا اور معاشرے کا مقدر سنوار سکتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ کچھ بزرگ تعلیم نسواں کے متعلق بڑی غلط فہمی رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم صرف لڑکوں ہی کو دینا ضروری ہے۔ تعلیم صرف روزگار کے لئے چاہئے۔ اس میدان میں صرف

مردوں کو آنا چاہئے۔ عورتیں صرف باورچی خانے کے لئے پیدا ہوئی ہیں اور ان کی زندگی باورچی خانے سے شروع ہو کر دستر خوان پر ختم ہو جاتی ہے۔اس طرح کی باتیں ہرگز درست نہیں۔ عورتیں بھی انسان ہیں۔ علم کی روشنی انسان کو جینا سکھاتی ہے۔ تاریخ اسلام میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں۔ خواتین کی ہمت وجرأت اور تدبر و فراست سے بڑے بڑے انقلابات ظہور پزیر ہوئے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کی والدہ اور زوجہ فرعون حضرت آسیہ کی مثال قرآن میں موجود ہے۔ حضرت آسیہ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے ظلم وستم سے محفوظ رکھ کر اپنی آغوش میں پروان چڑھایا۔ زوجہ رسول مکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت خدیجہؓ نے آپؐ سے شادی کے بعد اپنی تمام دولت خدمت اسلام کے لئے وقف کردی۔ ایسے ہی بنت رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہؓ نے اپنی آغوش میں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ جیسے سپوت پروان چڑھائے۔ حضرت امام حسنؓ نے دو گروہوں میں صلح کروا کر ملت کو خون خرابے سے بچایا اور حضرت امام حسینؓ نے جان قربان کرکے اسلام کی حفاظت کی۔ عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیت حضرت عبد القادر جیلانی کی ماں ہی تھیں کہ جن کی تربیت کا اثر تھا کہ بچپن میں آپ کے دست مبارک پر ڈاکوؤں نے توبہ کی۔
کسی دانا کا قول ہے کہ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہے۔ بچہ جو کچھ اس درس گاہ سے سیکھتا ہے وہ اس کی آئندہ زندگی پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ بچے کی بہترین تربیت کے لئے ماں کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ مفکرین کی رائے میں: ”مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے، جبکہ عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے“۔ فرانس کے مشہور بادشاہ نپولین کا قول ہے۔: ”آپ مجھے اچھی مائیں دیں، میں آپ کو بہترین قوم دوں گا۔“ علامہ اقبال کے فارسی شعر کا مفہوم ہے: ”قوموں کو کیا پیش آچکا ہے؟ کیا پیش آسکتا ہے؟ اور کیا پیش آنے والا ہے یہ سب ماؤں کی جبینوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔“
مذہب کو انسانی زندگی میں خاص مقام حاصل ہے۔ مذہب کی بنیادی تعلیمات اور اہم مسائل سے آگاہی مرد کے ساتھ ساتھ عورت کے لئے بھی اشد ضروری ہے۔ دین ہی وہ کامیاب راستہ ہے جس پر چل کر انسان دنیوی و اخروی زندگی کو کامیاب و کامران بنا سکتا ہے۔ پڑھی لکھی عورت مذہبی و دینی تعلیمات ومسائل سے اچھی طرح آگاہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کی تربیت دینی اصولوں کی روشنی میں بہتر انداز میں کرسکتی ہے اور ملک وملت کی تقدیر سنوار سکتی ہے۔ لیکن ایک ناخواندہ عورت جو دین ومذہب کی تعلیمات

سے نا آشنا اور غیر سلیقہ شعار ہوتی ہے، وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض بھی اچھے طریقے سے ادا نہیں کر سکتی۔

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب وہی قوم یا ملک اس جہاں پر حکمرانی کر سکتا ہے جو علم اور ٹیکنالوجی میں آگے ہے۔ اگر کسی ملک کی نصف آبادی یعنی خواتین پسماندہ ہوں گی تو وہ قوم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا عورتوں کے لئے تعلیم کا حصول اور واقفیت عامہ یا معلومات عامہ سے آراستہ ہونا نہایت ضروری ہو چکا ہے۔ آج کی دنیا نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ اس لئے ایک پڑھی لکھی عورت ہی اس نئے ماحول سے مطابقت پیدا کر سکتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت اپنا مافی الضمیر آسانی سے دوسرے تک پہنچا سکتی ہے۔ وہ اپنی رائے کا اظہار بہتر طریقے سے کر سکتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت ملک کی ترقی کے لئے اپنا کردار بہتر طریقے سے ادا کر سکتی ہے۔ وہ اپنے خاندان اور معاشرتی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ عورت پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر یا پائلٹ ہی بنے۔ عورت کی اولین ذمہ داری اس کا گھر ہے۔ وہ پڑھی لکھی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے روپ میں اپنی ذمہ داریوں کو زیادہ بہتر طریقے سے نبھا سکتی ہے

تعلیم نسواں کی اہمیت و تقاضے

Twitter Facebook WhatsApp

مقام / زیر اہتمام :

مدرسہ سیدنا ابو بکر صدیقؓ، جدہ، سعودی عرب

تاریخ بیان :

جولائی ۲۰۱۰ء

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میرے لیے یہ خوشی اور سعادت کی بات ہے کہ مدرسہ ابو بکر صدیقؓ جدہ میں دین کے حوالے سے آپ سے چند باتیں کہنے کا موقع مل رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارا جمع ہونا قبول فرمائے، کچھ مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر دینِ حق کی جو بات علم میں آئے سمجھ میں آئے اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازے۔ کسی لمبی تمہید کے بغیر دو تین باتیں آپ سے عرض کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات تو اس خوشی کا اظہار ہے کہ آپ اس سمر کورس (Summer Course) میں شریک ہیں جو دین کی تعلیم اور دینی معلومات کے حوالے سے ہے۔ آج کے دور میں جبکہ ہر مسلمان اپنے اپنے معاملات میں بے حد مصروف ہے یہ جو ریفریشر کورسز اور سمر کورسز وغیرہ ہیں یہ بہت ضروری ہیں اور بہت زیادہ فائدہ مند بھی ہیں۔ اگرچہ اصل ضرورت تو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی ہے لیکن باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا وقت اور گنجائش نہ ہو اور اس کی مہلت نہ ملے تو کم از کم اس طرح کے چھوٹے کورسز یعنی ایک ہفتے کا، ایک مہینے کا، دو ماہ کا، ان سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری ہے۔ دین کی معلومات حاصل کرنے سے ذوق بنتا ہے، حصولِ علم کا شوق پیدا ہوتا ہے اور انسان مزید علم و معلومات حاصل کرنے کے مواقع تلاش کرتا ہے۔

چنانچہ اس بات پر میں خوشی کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ خواتین اور بچیاں دینی معلومات کے حصول کے لیے اِس ایک مہینے کے سمر کورس میں شریک ہیں۔ میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے درخواست کرنا چاہوں گا کہ اِس کورس سے جتنا زیادہ استفادہ کر سکیں جتنی زیادہ معلومات حاصل کر سکیں اور جتنا زیادہ اپنے دینی علم میں اضافہ کر سکیں اس کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اسے اپنے دین و دنیا اور اپنی آخرت کے لیے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

ضروریاتِ دین کا علم حاصل کرنا

دینی تعلیم اور دین کے بارے میں معلومات کا حصول ہمارے فرائض میں سے ہے۔ جبکہ ضروریاتِ دین کا علم فرضِ عین کا درجہ رکھتا ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ کہ علم کا حاصل کرنا مسلمان مرد اور عورت دونوں کے لیے ضروری ہے۔ ضروریاتِ دین سے مراد وہ علم ہے جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۱) عقائد

پہلا یہ کہ مسلمان کے عقائد صحیح ہوں اور اسے صحیح و غلط عقیدے میں فرق کی پہچان ہو۔ یعنی وہ توحید و شرک اور حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہو اور سنت و بدعت کا فرق سمجھ سکتا ہو۔

۲) عبادات

ہر مسلمان کو فرائض اور واجبات کا علم ہو کہ میرے ذمے دین کی طرف سے کون سی باتیں فرض ہیں اور کونسی باتیں واجب ہیں۔ مثال کے طور پر:

- نماز کیسے صحیح ادا ہوتی ہے؟
- روزہ اپنی شرائط کے ساتھ کس طرح صحیح طور پر رکھا جاتا ہے؟
- حج کس پر فرض ہے اور اس کے ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟
- صاحبِ نصاب کسے کہتے ہیں؟ زکوٰۃ کس کس مد میں کتنے فیصد ادا ہوتی ہے اور اس کے صحیح مصارف کیا ہیں؟

ان باتوں کی معلومات حاصل کرنا ضروریات دین کا حصہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نماز کا طریقہ صحیح معلوم نہیں ہو گا تو نماز صحیح نہیں پڑھی جائے گی۔ نماز فاسد ہونے کے مسائل صحیح طور پر معلوم نہیں ہوں گے تو نماز خراب ہونے کا پتہ نہیں چلے گا۔ یہی صورت حال دوسری عبادات یعنی روزہ، حج اور زکوٰۃ کی بھی ہے۔

۳) حلال و حرام

اسی طرح حلال و حرام کا فرق معلوم ہونا ہر مسلمان کا فریضہ اور ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ کونسی چیز حلال ہے، کونسی چیز حرام ہے اور کونسی چیز مکروہ ہے۔ کونسی چیز کھانا جائز ہے اور کون سی چیز استعمال

کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ باتیں معلوم ہوں گی تو ایک مسلمان حلال و حرام میں فرق کر سکے گا، اگر معلوم نہیں ہوں گی تو ظاہر ہے یہ فرق نہیں کر سکے گا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں مجرم ٹھہرے گا۔ چنانچہ حلال و حرام کے مسائل معلوم ہونا بھی مسلمان مرد و عورت دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے اور فرض عین ہے۔

۴) معاملات و حقوق

اور پھر معاملات کا مسئلہ یعنی باہمی لین دین، ایک دوسرے سے تعلقات، رشتوں کی پہچان اور برتاؤ وغیرہ۔ یعنی ماں باپ، بیٹا بیٹی، بہن بھائی، میاں بیوی اور دیگر رشتہ دار، اسی طرح پڑوسی اور محلے دار وغیرہ۔ ان سب کے آپس کے تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ معاملات وغیرہ کا لحاظ رکھنا بھی دین کا حصہ ہے اور ان میں کمی و کوتاہی پر بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں گرفت ہوگی۔ ماں باپ کی حق تلفی ہو یا اولاد کی، رشتہ داروں کی حق تلفی ہو یا پڑوسیوں کی، ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ بیوی خاوند کی حق تلفی کرے گی تب پوچھا جائے گا، خاوند بیوی کی حق تلفی کرے گا تب پوچھا جائے گا۔ آپس کے وہ معاملات جن کے متعلق قیامت کے دن پوچھا جائے گا اور جن کا حساب دینا ہوگا ان کا جاننا ضروری ہے اور مسلمان کے فرائض میں شامل ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ نظام زندگی صحیح طور چل سکتا ہے اور نہ ہی اخروی نجات کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۵) اخلاقیات

اس کے بعد اخلاقیات کا درجہ آتا ہے۔ ایک ہے معاملات کے شرعی و قانونی تقاضے پورے کرنا، اور ایک ہے اس سے بڑھ کر احسن طریقے سے، رواداری اور قربانی کے جذبے کے ساتھ دوسروں کو سہولت دے کر معاملات کرنا۔ یعنی حسن سلوک، رحم دلی اور درگذر وغیرہ کی خصوصیات کا حامل ہونا۔ اس کا بھی ہمارے دین سے گہرا تعلق ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس کا بہترین مظہر ہے۔

میں نے عرض کیا کہ (۱) ایمانیات یعنی عقائد، (۲) عبادت یعنی فرائض وواجبات، (۳) حلال و حرام، (۴) حقوق و معاملات، (۵) اخلاقیات، یہ دین کے پانچ اہم شعبے ہیں جن کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد

وعورت پر فرض ہے۔یعنی وہ علم جس کے ساتھ مرد یاعورت ایک اچھے مسلمان اور انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرسکے۔

مردوعورت کے لیے علم کی یکساں اہمیت

علم کی اہمیت جس طرح ایک مرد کے لیے ہے اسی طرح ایک عورت کے لیے بھی ہے۔جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس سال تک جو دینی تعلیم دی اس سے مردوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور عورتوں نے بھی۔ جس طرح مردوں نے آپؐ کی تعلیم سے استفادہ کرکے آگے اور لوگوں کو تعلیم دی اسی طرح عورتوں نے بھی آپؐ کی تعلیم سے استفادہ کرکے آگے دوسروں تک یہ علم پہنچایا۔جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست استفادہ کرنے والوں میں مرد ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور عورتیں بھی سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ حضورؐ سے روایت کرنے والوں میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ محدثین نے روایات بیان کرتے ہوئے مرد و عورت میں یہ فرق نہیں کیا کہ مرد کی روایت زیادہ وزنی ہے اور عورت کی روایت کی حیثیت وہ نہیں ہے۔یعنی جو درجہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روایت کا ہے وہی درجہ حضرت عائشہؓ کی روایت کا بھی ہے۔ جو حضرت عمر فاروقؓ کی روایت کا درجہ ہے وہی حضرت حفصہؓ کی روایت کادرجہ ہے۔جو درجہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کاہے وہی درجہ حضرت ام شفاءؓ کی روایت کاہے۔ چنانچہ علم کے حصول میں اور علم کے آگے پہنچانے میں،روایت لینے میں اور روایت بیان کرنے میں، تعلیم حاصل کرنے میں اور تعلیم دینے میں، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں بہت سے علمی حلقے تھے۔ ان میں سے چند علمی حلقے بڑے سمجھے جاتے تھے جن میں ایک بڑا حلقہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھی تھا۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کاحلقہ،

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کاحلقہ،

(۳) حضرت ابوالدرداءؓ کاحلقہ،

(۴) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کاحلقہ،

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کاحلقہ،

(۶) ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کاحلقہ وغیر ذلک۔

حضرت عائشہؓ کا مقام

حضرت عائشہؓ صحابہ کرامؓ کے چھ بڑے محدثین میں اور سات بڑے مفتیان میں شمار ہوتی ہیں۔ یعنی حضرت عائشہؓ حدیث رسولؐ کے چھ بڑے راویوں میں سے ایک ہیں اور سات بڑے مفتیان میں سے ایک ہیں۔ اس لیے جب مجھے بہنوں اور بیٹیوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو یہ بات ضرور بتاتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ اتنی بڑی مفتیہ تھیں کہ اپنے معاصر مفتیوں کے فتوؤں پر نقد کر کے ان کے مقابلے میں فتویٰ دیتی تھیں، یہ کہہ کر کہ اُن کا فتویٰ غلط ہے اور میرا فتویٰ صحیح ہے۔ اور پھر حضرت عائشہؓ کا فتویٰ چلتا بھی تھا اور دلائل کی بنیاد پر تسلیم بھی کیا جاتا تھا۔ اس پر امام سیوطیؒ کا ایک مستقل رسالہ ہے "الاصابہ فی ما استدرکت عائشۃ علی الصحابہ" کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصر مفتیوں یعنی حضرت عمرؓ فاروق، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جیسے چوٹی کے صحابہ کے فتاویٰ پر نقد کی اور ان کے مقابلے میں فتاویٰ صادر کیے۔ حضرت عائشہؓ نے جو فتوے اپنے معاصر مفتیوں کے فتوؤں پر نقد کر کے دیے وہ امام سیوطیؒ نے اپنے اس رسالے میں جمع کیے ہیں۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے حضرت عائشہؓ کی سیرت پر اردو میں جو کتاب لکھی "سیرتِ عائشہؓ" انہوں نے اس میں امام سیوطیؒ کا یہ رسالہ اردو ترجمے کے ساتھ شامل کیا ہے۔

صحابہ کرامؓ میں جہاں مردوں کے علمی مراکز تھے اور تعلیمی درس گاہیں تھیں وہاں خواتین کی درس گاہیں بھی تھیں۔ ان میں ایک بڑی درس گاہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی تھی۔ تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں حضرت عائشہؓ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ حضورؐ کے وصال کے بعد تقریباً چالیس سال تک حضرت عائشہؓ کا یہ معمول رہا کہ وہ اپنے حجرے میں صبح نماز کے بعد اپنے معمولات اور اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرے کا دروازہ کھولتی تھیں جس کے اندر پردہ لٹکا ہوتا تھا۔ دروازہ کھل جانے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اماں جان اپنی مسند پر بیٹھ گئی ہیں۔ طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ لوگ آتے تھے اور دروازے کے باہر کھڑے ہو کر سلام کہتے اور تعارف کراتے کہ میں فلاں شخص ہوں اور اِس مسئلے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت عائشہؓ اجازت دیتیں تو آنے والا ایک شخص ہوتا یا ایک سے زیادہ، وہ آکر کمرے کے اندر پردے کے دوسری طرف بیٹھ جاتے۔ کوئی قرآن کریم کی آیت کا مطلب پوچھتا، کوئی کسی حدیث کے متعلق دریافت کرتا، کوئی وراثت کا مسئلہ پوچھتا اور کوئی اپنے کسی شرعی معاملے میں راہنمائی لیتا۔ چنانچہ ظہر تک یہ

سلسلہ چلتا رہتا تھا اور ظہر کے بعد یہ دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ کم و بیش چار عشروں تک ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ معمول رہا۔

تاریخ میں ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہے۔ حضرت عائشہؓ کے ایک بھانجے تھے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ۔ حضرت عائشہؓ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن ان کی کنیت ام عبد اللہ مذکور ہے جو ان کے اسی بھانجے کے حوالے سے ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر اور حضرت عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہؓ کی گود میں پرورش پائی۔ ماں اور خالہ ایک ہی بات ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ ام عبد اللہ کہلاتی تھیں۔ پھر ایک زمانے میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ امیر المؤمنین ہوئے اور مسلمانوں کے حکمران بنے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس دولت بہت آتی تھی اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو دل بھی بڑا دیا تھا کہ آپؓ بہت سخی تھیں۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ دو صفات کم ہی جمع ہوتی ہیں کہ دولت بھی ہو اور دل بھی۔ کسی کے پاس دولت ہوتی ہے تو دل نہیں ہوتا اور اگر دل ہوتا ہے تو دولت نہیں ہوتی۔ لیکن حضرت عائشہؓ کو اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں عطا فرمائے تھے۔ آپؓ کے پاس بہت ہدیے اور عطیات آتے تھے لیکن شام کے وقت گھر میں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کی ایک شاگرد تھیں عمرہ بنت عبد الرحمنؒ جو حضرت عائشہؓ کی علمی جانشین بھی تھیں۔ یہ تابعیہ ہیں اور حضرت اسعد بن زرارہؓ کی پوتی ہیں۔ عمرہؒ حضرت عائشہؓ کا مزاج بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ ایک دفعہ کسی نے ایک لاکھ درہم ہدیہ بھیجا۔ یہ ہدیہ تھا صدقہ نہیں تھا۔ ایک درہم ساڑھے تین ماشے چاندی کا ہوتا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اس کا حساب لگوایا تھا یہ تقریباً ایک یورو کے برابر بنتا ہے، یعنی آج کل کے حساب سے یہ امریکی ڈالر سے بڑا اور برطانوی پاؤنڈ سے چھوٹا ہے۔ عمرہؒ فرماتی ہیں کہ سارا دن ہماری یہ ڈیوٹی رہی کہ یہ برتن بھر کر فلاں گھر میں دے آؤ، فلاں یتیم کے گھر میں، فلاں بیوہ کے گھر میں، فلاں مسکین اور ضرورت مند کے گھر میں، فلاں معذور کے گھر میں اور فلاں مجاہد کے گھر میں۔ ہم گھر کے جتنے افراد تھے وہ سارا دن یہی کام کرتے رہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ شام سے پہلے وہ ساری رقم تقسیم ہو چکی تھی۔ شام کو جب روزہ کھولنے کا وقت آیا تو عمرہ کہتی ہیں کہ گھر میں روزہ کھولنے کے لیے کچھ نہیں تھا، میں نے کہا کہ اماں جان گھر میں تو روزہ کھولنے کے لیے کھجور بھی نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ڈانٹا کہ پہلے بتاتی کہ میں دس پندرہ درہم بچا لیتی جس سے ہم کھجوریں منگوا لیتے، اب میرے پاس کچھ نہیں ہے اس لیے اب ہم پانی سے روزہ کھولیں گے۔

یہ حضرت عائشہؓ کا مزاج تھا۔ اس پر حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے ایک دن کہہ دیا کہ خالہ سارے پیسے لوگوں میں بانٹ دیتی ہیں اور اپنے لیے بھی نہیں رکھتیں اور گھر کا بھی خیال نہیں کرتیں۔ اس لیے میں اب خالہ کا ہاتھ روکوں گا یعنی خالہ کو سارے پیسے تقسیم نہیں کرنے دوں گا۔ اس پر حضرت عائشہؓ ناراض ہوئیں اور فرمایا کہ اللہ مجھے دیتا ہے اور میں اللہ کے بندوں کو دیتی ہوں، یہ عبد اللہ کون ہوتا ہے میرا ہاتھ روکنے والا۔ اس قدر ناراض ہوئیں کہ قسم اٹھالی کہ آج کے بعد عبد اللہ سے کلام نہیں کروں گی اور عبد اللہ کو میرے گھر میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے مسئلہ پیدا ہو گیا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ بھانجے تھے اور گود میں پرورش پائی تھی۔ انہیں پریشانی لاحق ہو گئی، پہلے خود پیغامات بھیجتے رہے اور پھر سفارشی درمیان میں ڈالتے رہے لیکن حضرت عائشہؓ نے کہا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، عبد اللہ کو یہ کہنے کا حوصلہ کیسے ہوا کہ یہ مجھے اللہ کی دی ہوئی دولت کو اللہ کے بندوں میں تقسیم نہیں کرنے دے گا۔ محدثین لکھتے ہیں کہ جب ناراضگی حد سے بڑھی اور معاملہ لمبا ہو گیا تو حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے دوستوں سے مشورہ کیا کہ اماں جان کو کیسے راضی کروں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ ہماری نظر میں تو ایک ہی صورت ممکن ہے، وہ یہ کہ اگر حضورؐ کے ننھیال کے خاندان یعنی حضرت آمنہؓ کے خاندان میں سے کوئی بزرگ شخص اگر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آگیا تو اس کی بات حضرت عائشہؓ رد نہیں کر سکیں گی، اس کے علاوہ تو یوں لگتا ہے کہ اور کسی کی بات وہ نہیں مانیں گی۔ یعنی بنو نجار سے کوئی بزرگ اگر آگئے تو بات بن جائے گی۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے حضورؐ کے ننھیال خاندان میں سے دو بزرگ تلاش کیے اور حضورؐ کی خدمت میں سفارش کے لیے لائے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو حضرت عائشہؓ کی طرف سے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی، کسی طرح اندر آئیں گے تبھی معافی کی درخواست کر سکیں گے۔ ان بزرگوں میں ایک مسور بن مخرمہؓ اور دوسرے عبد الرحمان بن سمرہؓ تھے۔ انہوں نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر کہا، السلام علیکم ام المؤمنین۔ حضرت عائشہؓ نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کون۔ انہوں نے بتایا کہ ہم کچھ آدمی آپ کی خدمت میں آئے ہیں، کیا ہم اندر آجائیں؟ حضرت عائشہؓ نے اجازت دے دی۔ باباجی نے پوچھا کیا ہم سارے ہی آجائیں؟ حضرت عائشہؓ نے کہا، ہاں ٹھیک ہے آجائیں۔ اب ان سب میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ بھی تھے۔ چنانچہ اس حیلے سے وہ عبد اللہؓ کو اندر لے کر

گئے۔ باباجی نے عبد اللہ سے کہا کہ ہم بات کریں گے اور جب بات کے دوران ایک خاص مقام پر پہنچیں گے تو تم پردے کے پیچھے اندر چلے جانا اور خالہ جی کے قدموں میں جاکر گر جانا۔ چنانچہ اس حیلے اور تدبیر سے خالہ کو راضی کیا گیا۔ حضرت عائشہؓ نے قسم توڑی اور کفارہ ادا کیا، ایک روایت میں یہ ہے کہ اس کفارے میں چالیس غلام آزاد کیے۔

جن لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے سب سے زیادہ استفادہ کیا میں اس وقت ان میں سے چند افراد کا حوالہ دوں گا۔ ایک تو حضرت عروہ بن زبیرؓ ہیں جو کہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے چھوٹے بھائی تھے۔ دوسرے حضرت عائشہؓ کے بھتیجے حضرت قاسم بن محمدؒ، اور تیسری وہ خاتون عمرہؒ بنت عبد الرحمن جن کا میں نے پہلے ذکر کیا۔ ان تینوں کو حضرت عائشہؓ کے علوم کا وارث سمجھا جاتا ہے۔ عروہؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں قرآن مجید کی تفسیر، حدیث، عرب قبائل کے نسب نامے، شعر و ادب، وراثت اور طب، ان علوم میں حضرت عائشہؓ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ جتنے اشعار حضرت عائشہؓ کو یاد تھے اس زمانے میں شاید کسی اور کو اتنے یاد ہوں۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ تابعین کے امام سمجھے جاتے ہیں۔

مجھ سے کوئی پوچھتا ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا نصاب کیا ہونا چاہیے تو میں کہا کرتا ہوں کہ وہی جو حضرت عائشہؓ کا تھا۔ یعنی عورتیں کیا کچھ پڑھ سکتی ہیں تو میں کہا کرتا ہوں کہ وہی کچھ جو حضرت عائشہؓ نے پڑھا تھا۔ اور انہوں نے یہ سب کچھ حضورؐ کے گھر میں ہی پڑھا تھا۔ کم عمری میں وہ حضورؐ کے گھر آگئی تھیں اور پھر ۹ سال تک علم حاصل کیا۔ اسی طرح ایک بڑے صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہیں جو کہ حضرت عائشہؓ کے معاصرین میں سے ہیں۔ عروہؒ کا شمار چھوٹوں میں تھا، وہ حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے اور شاگرد بھی تھے۔ ایک شاگرد تو یہ بات کہے گا ہی کہ میرا استاد سب سے زیادہ علوم کا حامل ہے۔ اصل رائے تو وہ ہے جو ایک معاصر اپنے معاصرین میں سے کسی کے بارے میں دے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ خود فقیہ ہیں، حدیث کے بڑے راویوں میں سے ہیں اور بڑے صحابہؓ میں سے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ما اشکل علینا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم قط الا وجدنا فیہ عندھا علما کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم صحابہ کرامؓ کسی مشکل میں پھنسے ہوں اور حضرت عائشہؓ کے پاس راہنمائی اور علم نہ ملا ہو۔ یہ حضرت عائشہؓ کی علمی عظمت کا ایک معاصر کی طرف سے اعتراف ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریمؐ سے استفادہ کرنے والوں میں جہاں مرد تھے وہاں عورتیں بھی تھیں، جہاں مردوں کی درسگاہیں تھیں وہاں عورتوں کی درسگاہیں بھی تھیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پردے کا اہتمام تعلیمی سلسلے میں حائل ہے۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ نے چالیس سال تک پڑھایا اور امت کے ایک بڑے حصے نے ان سے استفادہ کیا لیکن اس میں پردہ کبھی رکاوٹ نہیں بنا، تعلیم بھی ہوئی اور پردہ بھی رہا۔

حضرت عائشہؓ ہر سال حج پر جاتی تھیں۔ ایک مقصد توجہ ہوتا تھا جبکہ دوسرا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی رہنمائی کی جائے جو حج کے موقع پر دنیا بھر سے آتے تھے اور انہیں مسائل وغیرہ پوچھنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ چنانچہ اہل علم کو اس لیے بھی جانا چاہیے کہ لوگوں کی راہنمائی ہو۔ کہتے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا کہ منیٰ میں چار پانچ بزرگوں کے بڑے علمی مراجع ہوتے تھے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کے خیمے ہوتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اس سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ حج کے موسم میں سب سے بڑا اور بھرپور علمی مرکز حضرت عائشہؓ کا خیمہ ہوتا تھا۔ ترتیب یہ ہوتی تھی کہ ایک بہت بڑا خیمہ لگایا جاتا تھا جس کے درمیان میں ایک چھوٹا گول خیمہ ہوتا تھا جس میں ایک دو آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ حضرت عائشہؓ خود اس چھوٹے خیمے میں بیٹھتی تھیں جبکہ لوگ باہر بڑے خیمے میں آتے تھے اور آکر عرض کرتے تھے کہ اماں جان یہ مسئلہ ہے آپ کی راہنمائی چاہیے۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ منیٰ میں دو بڑے علمی خیمے ہوتے تھے۔ ایک حضرت عائشہؓ کا اور دوسرا حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا۔ چنانچہ راہنمائی میں تعلیم میں فتوے میں اور لوگوں کو دین سکھانے میں حضرت عائشہؓ کا کردار دوسرے اکابر صحابہؓ سے کم نہیں تھا۔

امام مالک بن انسؒ کی محدثہ بیٹی

امام مالک بن انسؒ محدثین میں ایک بڑے محدث گزرے ہیں اور اہل سنت کے چار بڑے ائمہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ امام دار الھجرہ اور امام مدینہ کے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ امت کے صف اول کے محدث ہیں اور صف اول کے فقیہ ہیں۔ امام صاحبؒ نے ساری زندگی مسجد نبوی میں حدیث پڑھائی جہاں بڑے بڑے محدثین ان کے سامنے بیٹھ کر ان سے حدیث پڑھا کرتے تھے۔ قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ

ان کی مسند کی ترتیب یہ تھی کہ شاگرد آتے تھے اور حدیث سناتے تھے، سنانے والا کوئی غلطی کرتا تو امام صاحبؒ اس کی نشاندہی کرتے اور کسی بات کی وضاحت کی ضرورت ہوتی تو بتاتے۔ امام مالکؒ کی مسند کے ساتھ ایک پردہ لٹکا ہوتا تھا جس کے پیچھے ایک خاتون بیٹھتی تھیں۔ یہ امام صاحبؒ کی اپنی بیٹی تھیں۔ ہوتا یوں تھا کہ کبھی پڑھنے والے سے کوئی غلطی ہو جاتی اور امام صاحبؒ کا اس طرح دھیان نہ جاتا تو امام صاحب کی بیٹی پردے کے پیچھے سے تپائی کھٹکھٹا کر توجہ دلاتیں کہ غلطی ہو گئی ہے۔ وہ خود منہ سے کچھ بولتی نہیں تھیں لیکن توجہ دہی کے لیے تپائی پر ہاتھ مار کر بتاتی تھیں کہ پڑھنے والے نے ٹھیک نہیں پڑھا۔ اس پر امام صاحب کہتے اعد کہ پھر پڑھو بھئی۔ اس طرح غلطی پکڑی جاتی تھی۔ تو میں کہا کرتا ہوں کہ یہ امام صاحب کی بیٹی اتنی بڑی محدثہ تھیں کہ شاگرد کی غلطی تو پکڑتی ہی تھیں، خود استاد کو بھی چیک کرتی تھیں کہ انہوں نے غلطی پکڑی ہے یا نہیں۔ قاضی عیاضؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام مالکؒ کا بیٹا نہیں پڑھ سکا تھا لیکن بیٹی اس درجے کی محدثہ تھی۔ جب کبھی بیٹا سامنے سے گزرتا تو حسرت سے امام صاحبؒ فرماتے کہ دیکھو وہ میرا بیٹا جا رہا ہے اور یہ میری بیٹی بیٹھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ علم کی یہ عظمت جس کو چاہیں عطا فرماتے ہیں۔

خیر القرون کی خواتین کا علمی معیار

حضرت امام محمد بن ادریس الشافعیؒ بھی اہل سنت کے چار بڑے ائمہ میں سے ہیں، امام اہل سنت ہیں اور ہمارے سر کا تاج ہیں۔ ان کی والدہ کا قصہ امام تاج الدین السبکیؒ نے ''الطبقات الکبریٰ للشافعیۃ'' میں نقل کیا ہے۔ میں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اس زمانے یعنی خیر القرون میں عورتوں کے علم کی سطح اور معیار کیا ہوتا تھا۔ قرآن مجید نے بہت سے مقدمات میں گواہ کا نصاب بیان کیا ہے کہ دو مرد گواہ ہوں، اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ فَإِن لَّم يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ (البقرہ: ۲۸۲) اگر دو گواہ (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بناؤ) ایسے گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ قصہ یہ تھا کہ قاضی صاحب کی عدالت میں ایک مقدمہ تھا جس میں ایک مرد اور دو عورتیں گواہ تھے۔ ان دو عورتوں میں سے ایک حضرت امام شافعیؒ کی والدہ تھیں۔ قاضی صاحب نے مقدمہ کے دوران گواہی سنی۔ قاضی صاحب کو خیال ہوا کہ میں نے ان عورتوں سے اکٹھی گواہی سنی ہے اگر میں ان سے الگ الگ گواہی سنوں اور جرح کروں تو ممکن ہے کہ کوئی فرق موجود ہو جو

واضح ہو جائے۔ قاضی صاحب نے امام شافعیؒ کی والدہ سے کہا کہ بی بی آپ ذرا فاصلے پر بیٹھیں میں ان سے پہلے پوچھوں گا اس کے بعد آپ کو بلا کر آپ سے پوچھوں گا۔ امام شافعیؒ کی والدہ اڑ گئیں کہ قاضی صاحب آپ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن مجید آپ کو اجازت نہیں دیتا۔ قاضی صاحب نے کہا اچھا! قرآن مجید میں یہ مسئلہ کہاں ہے؟ امام شافعیؒ کی والدہ نے کہا کہ قرآن مجید میں جہاں اللہ رب العزت نے گواہی کا ذکر کیا ہے کہ ایک مرد اور دو عورتیں ہوں یعنی دوسرے مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ ہوں تو اس کی ساتھ حکمت بیان کی ہے کہ ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخریٰ (البقرہ: ۲۸۲) تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرادے۔

میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے یہاں یہ بات ذکر کرنا چاہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی نفسیات میں بھی فرق رکھا ہے اور ان کی ذمہ داریوں میں بھی۔ میں اپنے تجربے کی ایک بات بتاتا ہوں کہ عورت مرد کی بہ نسبت جلدی یاد کرتی ہے۔ جو چیز مرد ایک سال میں یاد کرے گا عورت عام طور پر اس سے کم عرصے میں چھ یا سات مہینے میں یاد کرلے گی۔ میری بہنیں اور بیٹیاں اگر محسوس نہ کریں تو میں عرض کروں کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو بہت زبردست کیمرہ دیا ہے۔ میاں بیوی کہیں سے آرہے ہوتے ہیں تو راستے میں عورت نے کسی کو اگر ایک نظر بھی دیکھا ہو گا تو اسے آنکھوں کا رنگ بھی یاد ہو گا، ناک کی طرز بھی یاد ہو گی، کپڑے کا ڈیزائن بھی یاد ہو گا، دانت اگر نظر آئے ہوں گے تو ان کی چہرے کے ساتھ مناسبت بھی یاد ہو گی۔ اور پھر گھر آکر تبصرہ کرے گی کہ اس کی ناک ایسی تھی، اس کے کان ایسے تھے اور اس کی آنکھ ایسی تھی۔ اور مرد بیچارے کے وہم و گمان بھی نہیں ہے کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے۔ مردوں میں یہ صلاحیت اس درجہ کی نہیں ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ عورتیں بہت جلدی یاد کرتی ہیں اور یہ بات کریڈٹ کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بات ڈس کریڈٹ کی بھی ہے کہ وہ جلدی بھول جاتی ہیں۔ عورتوں کے متعلق ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اصل بات کے ساتھ بہت سی غیر متعلقہ باتیں بھی کرتی ہیں۔ عام طور پر مرد جو بات دو منٹ میں کرے گا، عورت دس منٹ میں کرے گی۔ تو قرآن مجید نے عورت کی نفسیات کے پیش نظر یہ حکمت بیان کی کہ ایک عورت اگر بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے۔ یا اس طرح کہہ لیں کہ اگر ایک عورت غیر متعلقہ باتیں کر کے اصل موضوع سے ہٹنے لگے تو دوسری اسے یاد کرادے کہ نہیں بہن اصل بات اتنی تھی۔

چنانچہ امام شافعیؒ کی والدہ نے کہا کہ قاضی صاحب ہم تو اکٹھی ہی گواہی دیں گی، یہ بھولے گی تو میں بتاؤں گی اور میں بھولوں گی تو یہ بتائے گی۔ یہ پٹڑی سے اترے گی تو میں اسے اصل بات کی طرف واپس لاؤں گی اور میں اگر غلط بات کروں گی تو یہ لقمہ دے گی۔ میں بات یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ایک خاتون قرآن مجید سے استنباط کر کے عدالت کے قاضی صاحب کو بتا رہی ہے کہ دو خاتون گواہوں کو الگ الگ کرنے کا ان کا طریق کار ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہ ایسا مضبوط استدلال ہے کہ قاضی صاحب کو ماننا پڑا کہ بی بی تم ٹھیک کہتی ہو میں غلط تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں عورتوں کے علم کا معیار یہ تھا۔

اسی طرح قرون اولیٰ میں عورتوں کے علم کا ایک اور واقعہ عرض کر دیتا ہوں۔ یعنی عورت کا اس زمانے میں قرآن و سنت سے استنباط، حدیث، فقہ، تفقہ، استفتاء وغیرہ میں عورتوں کے علم کا معیار کیا تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے جمعہ کے خطبے میں ایک حکم نامہ جاری کیا۔ فرمایا کہ لوگ شادی میں مہر کی بڑی بڑی رقمیں مقرر کر دیتے ہیں اور بعد میں ان کی ادائیگی میں جھگڑے ہوتے ہیں، اس لیے میں یہ مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔ یہ آج کے دور میں بھی ہوتا ہے کہ شادی کے وقت تو لوگوں کو دکھانے کے لیے مہر کی بڑی بڑی رقمیں مقرر کر دی جاتی ہیں لیکن بعد میں حیلے بہانے کر کے عورت سے معاف کرانے کی فکر ہوتی ہے، اور ہمارے ہاں عام طور پر بیوی کو مہر عملاً ادا نہیں کیا جاتا۔ تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ شادی کے وقت چونکہ خوشی کا موقع ہوتا ہے تو بے فکری میں اور شادی کے شوق میں لوگ بڑی بڑی رقمیں مقرر کر لیتے ہیں لیکن جب ادائیگی کی نوبت آتی ہے تو جھگڑے ہوتے ہیں، تنازعات ہوتے ہیں اور معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ فرمایا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر کی رقم پر پابندی لگا دوں۔ پھر حضرت عمرؓ نے اعلان فرما دیا کہ آج کے بعد کسی شادی میں مہر کی رقم چار سو درہم سے زیادہ مقرر نہیں کی جائے گی۔ اس زمانے کے چار سو درہم آج کے تقریباً چار سو یورو کے برابر بنتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ کسی شادی میں ایسا کیا گیا ہے تو چار سو درہم سے زائد رقم ضبط کر کے بیت المال میں جمع کروا دی جائے گی۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر کا آرڈر تھا اس لیے نافذ ہو گیا۔ جمعے کے بعد فارغ ہوئے تو واپسی پر راستے میں ایک بی بی نے راستہ روک لیا کہ امیر المؤمنین ذرا ٹھہریے۔ امرأۃ قرشیۃ، اس خاتون کا نام روایت میں نہیں ہے۔ قریش کی ایک خاتون نے راستہ روک کر کہا کہ آپ نے مہر پر پابندی لگا دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ جی لگا دی ہے۔ خاتون نے

پوچھا، آپ نے یہ اعلان کیا ہے کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر کی رقم مقرر نہ کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، جی یہی اعلان کیا ہے۔ خاتون نے پوچھا، آپ نے کہا کہ زائد رقم ضبط کر لی جائے گی۔ حضرت عمرؓ نے کہا، ہاں ایسا ہی کہا ہے۔ خاتون نے کہا، آپ کو ایسا کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ ایک خاتون امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے کہہ رہی ہے کہ کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا کہ آپ نے مہر پر پابندی لگا دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا، خاتون، یہ قرآن میں کہاں ہے؟

امام بخاریؒ حضرت عمرؓ کے اوصاف کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کان وقافاً عند کتاب اللہ یعنی حضرت عمرؓ کا یہ مزاج تھا کہ قرآن مجید کا حکم سامنے آتے ہی ان کو بریک لگ جاتی تھی۔ اور جب تک بات کی پوری تسلی نہیں ہوتی تھی آگے نہیں بڑھتے تھے۔ تو حضرت عمرؓ نے خاتون سے پوچھا کہ قرآن میں یہ بات کہاں ہے؟ اس خاتون نے قرآن مجید کی آیت پیش کی اور استدلال کیا کہ جب قرآن خاوندوں سے ہم عورتوں کو پیسے دلواتا ہے تو یہ اصطلاح استعمال کرتا ہے اٰتیتم احداھن قنطارًا افلا تاخذوا منہ شیئا (سورہ النساء: ۲۰) اگر تم خاوندوں نے اپنی عورتوں کو انبار برابر رقم بھی دے دی ہے تو وہ رقم واپس نہ مانگنا شروع کر دو۔ جو رقم دے دی بس دے دی۔ قنطار ڈھیر کو کہتے ہیں کہ جو چیز گنی نہ جا سکے۔ عورت نے کہا کہ حضرت قرآن تو ہمیں ڈھیروں کے حساب سے دلواتا ہے لیکن آپ نے شرط لگا دی ہے کہ چار سو درہم سے زیادہ مت دو۔ حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ وہیں سے مسجد میں واپس گئے اگلے جمعے کا انتظار نہیں کیا، جو لوگ موجود تھے ان سے کہا کہ ٹھہرو بھئی، میں نے ابھی ایک اعلان کیا تھا اور چار سو درہم سے زائد مہر کی رقم پر پابندی لگائی تھی۔ ایک خاتون نے مجھے قرآن مجید کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے ابھی توجہ دلائی ہے۔ خدا کی قسم میرا دھیان ادھر نہیں تھا، اس عورت نے توجہ دلائی ہے تو میرا دھیان ہوا ہے۔ امرأۃ اصابت واخطأ رجل کہ عورت ٹھیک کہتی ہے، مرد سے غلطی ہو گئی ہے۔ میں اپنا آرڈر واپس لیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک خاتون کے توجہ دلانے پر اپنا آرڈر واپس لیا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس زمانے میں ہماری عورتوں کے علم کا معیار یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے سامنے بحث کر رہی ہے استدلال کر رہی ہے اور حضرت عمرؓ کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر رہی ہے۔ میں نے یہ چند باتیں آپ خواتین کی حوصلہ افزائی کے لیے کی ہیں کہ آپ کوئی انوکھا یا عجیب کام نہیں کر رہیں۔

علم حاصل کرنا، علم میں آگے بڑھنا، علم کو فروغ دینا، شرعی دائرے میں رہ کر لوگوں کی راہنمائی کرنا، اس میں آپ خواتین کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مردوں کا۔

امت مسلمہ کی ہزاروں محدثات کے حالات

حدیث کی روایات نقل کرنے میں جہاں سینکڑوں صحابہؓ تھے وہاں سینکڑوں صحابیات بھی تھیں۔ جیسے مردوں نے احادیث روایات کیں ویسے ہی عورتوں نے بھی احادیث روایت کی ہیں۔ آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے آکسفورڈ، انگلینڈ میں ایک اسلامی سنٹر ہے۔ وہاں ہمارے ایک دوست ڈاکٹر محمد اکرم ندوی حدیث کے متخصص ہیں۔ انہوں نے دکتورہ (پی ایچ ڈی) بھی حدیث ہی میں کی ہے، بڑے عالم ہیں۔ انہوں نے دس سال محنت کر کے امت مسلمہ کی محدثات پر کام کیا ہے۔ یعنی وہ خواتین جنہوں نے حدیث پڑھی اور پھر حدیث پڑھائی، جنہوں نے روایت لی اور پھر روایت آگے دی۔ انہوں نے گزشتہ چودہ سو سال میں آٹھ ہزار محدثات کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ میں بھی اس کتاب کی ترتیب کے دوران بعض مشوروں میں شریک رہا ہوں۔ الوفاء فی اخبار النساء کے نام سے یہ پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل چالیس جلدوں کی کتاب ہے اور بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔

الشیخۃ امۃ اللہ محدثہ دہلویہؒ

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ پاکستان کے ماضی قریب کے بڑے محدثین میں سے تھے۔ انہوں نے کسی جگہ اپنے درس میں ایک خاتون محدثہ کا ذکر کیا کہ مجھے ان سے شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے بھی اپنے ایک خطبے میں ان خاتون محدثہ کا ذکر کیا کہ مجھے بھی اماں جان کی خدمت میں حاضری اور روایت حدیث کا شرف حاصل ہے۔ پاکستان کے ایک بہت بڑے محدث گزرے ہیں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، وہ حافظ الحدیث تھے اس معنٰی میں کہ اپنے معاصر محدثین میں حدیث کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ سے بڑا بھی کوئی حافظ الحدیث ہے؟ فرمایا میں نے جتنے محدثین سے ملاقاتیں کی ہیں ان میں سے کسی کو بھی مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد نہیں ہیں لیکن مکہ مکرمہ میں ایک عورت محدثہ کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں۔ وہ خاتون جن کی شاگردی پر حضرت مولانا یوسف بنوریؒ فخر کر رہے ہیں، جن کی شاگردی کا حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ فخر سے ذکر کر رہے ہیں، جنہیں حضرت عبد اللہ درخواستیؒ اپنے سے بڑا حافظ الحدیث بتا رہے

ہیں۔ یہ خاتون تھیں الشیخۃ امۃ اللہ محدثہ دہلویہ۔ دہلی کے ایک بڑے محدث حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلویؒ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ آ گئے تھے، یہ خاتون ان کی بیٹی تھیں اور شاگرد و جانشین بھی تھیں۔ ان خاتون نے سو سال سے زیادہ عمر پائی اور ۸۰ سال کے لگ بھگ حدیث پڑھائی۔ آخر عمر میں ان کی کیفیت یہ تھی کہ دور دراز سے حدیث کے جو اساتذہ عمرہ یا حج پر آتے تھے وہ اماں جان کو تلاش کرتے تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، روایت سناتے تھے سنتے تھے اور پھر ساری زندگی فخر کرتے تھے کہ مجھے الشیخۃ امۃ اللہ سے روایت حدیث کی اجازت حاصل ہے۔ ان کا سن ۱۹۴۵ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ بحمد اللہ تعالیٰ مجھے بھی مکہ مکرمہ کے ایک بڑے محدث الشیخ ابو الفیض محمد یاسین الفادانی المکی الشافعیؒ کے واسطے سے الشیخۃ اَمۃ اللہؒ سے روایت حدیث کی اجازت حاصل ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک میری قریب ترین سندِ حدیث ہے۔

میں نے بتایا کہ علم تفسیر کا ہو، حدیث کا ہو، فقہ کا ہو یا دین کا کوئی علم بھی ہو، عورتیں مردوں سے کم نہیں رہیں۔ حصول علم دین کے لیے عورت کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مرد کا حق ہے۔ بلکہ عورت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ مرد اگر علم حاصل کرے گا تو اپنی ذات کے لیے کرے گا لیکن اگر عورت علم حاصل کرے گی تو پورے گھرانے کے لیے کرے گی۔ اگر عورت عالمہ ہے تو اس کا گھرانہ بھی عالم ہے اس لیے کہ گھر کا انتظام تو عورت نے ہی کنٹرول کرنا ہے۔ گھر سے باہر کی حکمرانی مرد کی ہے اور گھر کے اندر کی حکمرانی عورت کی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا کہ گھر کے اندر کی حکمرانی عورت کی ہے۔ تعلیم و تربیت بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور گھر کا نظام بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ عورت اگر عالمہ ہے دین جانتی ہے دینی معلومات رکھتی ہے تو گھر کا ماحول بھی اس کے مطابق ہو گا۔

ان گزارشات کے ساتھ میں ایک بار پھر آپ بہنوں اور بیٹیوں سے یہ عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ حضرات کو موقع دیا ہے، زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں اور اس کام کو جتنا زیادہ پھیلا سکیں، پھیلائیں۔ یہ ہمارے گھروں کی ضرورت بھی ہے اور بحیثیت مجموعی امت کی ضرورت بھی ہے کہ خواتین کی زیادہ سے زیادہ علم کے ساتھ مناسبت ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

والدین کا احترام

علامہ پیر محمد تبسم بشیر اویسی سجادہ نشین مرکز اویسیاں نارووال پنجاب پاکستان

دنیا کا ہر مذہب اور تہذیب اس بات پر متفق ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے ان کا ادب و احترام ملحوظ خاطر رکھنا چاہئیے۔اس بارے میں قرآن کی تعلیم سب سے زیادہ اہم اور اپنے ایک انفرادی اسلوب کی حامل ہے۔مثلاً جب کبھی اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف توجہ دلانا چاہی ہے اس کے فوراً بعد والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کی تعلیم دی ہے۔سورۃ لقمان:14(ترجمہ)اے بندو تم میرا(اللہ کا)شکر کرو اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو تم تمام کو میری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

سندھ:14 کوروناویکسینیشن سینٹرز قائم،تربیت یافتہ عملہ اور سامان پہنچادیا گیا

یاد رکھئے کہ جس طرح سے اللہ کے حقوق ہم پر فرض ہیں بالکل اسی طرح انسانوں کے حقوق بھی ہم پر فرض ہیں اور اتنے ہی اہم ہیں۔انسانوں میں والدین کے حقوق سب سے بڑھ کر ہیں۔ماں باپ کی کے ساتھ حسن سلوک کرنے والوں کو جنت کی بشارت دی گی ہے۔سورۃ الاحقاف 15-16(ترجمہ)اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے،اس کی ماں نے اسے تکلیف جھیل کر پیٹ میں رکھا اور تکلیف برداشت کر کے اسے جنم دیا،اس کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے۔یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا تو کہنے لگا اے میرے پروردگار!مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر بجالائوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں ایسے نیک عمل کروں جن سے تو خوش ہو جائے اور تو میری اولاد بھی صالح بنا۔میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے نیک اعمال کو ہم قبول فرمالیتے ہیں اور جن کے بد اعمال سے درگزر کر لیتے ہیں،(یہ) جنتی لوگوں میں ہیں۔اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا تھا۔والدین سے نافرمانی کرنے والوں کے لئے گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔سورۃ الاحقاف:17-18(ترجمہ)اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم سے میں تنگ آ گیا،تم مجھ سے یہی کہتے رہو گے کہ میں مرنے کے بعد پھر زندہ کیا جائوں گا مجھ سے پہلے بھی امتیں گزر چکی ہیں،وہ دونوں والدین جناب باری میں فریادیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں تجھے خرابی ہو تو ایمان لے آ،بیشک اللہ کا وعدہ حق ہے،وہ جواب دیتا ہے کہ یہ تو صرف اگلوں کے افسانے ہیں،یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو

چکا ہے اور جنوں اور انسانوں کی ان امتوں میں شامل ہو گئے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، یقیناوہ تھے ہی گھاٹا اٹھانے والے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے بھی کہا کہ: صل امک ثم امک ثم امک ثم اباک ثم ابافاناک۔ ”تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو تم اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرو تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو پھر تم اپنے باپ کے ساتھ صلہ رحمی کرو، پھر تم اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ پھر اسکے بعد دور کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ (مظہری)

عمران خان کا احتساب، کرپشن کا جھوٹا چورن ختم ہو گیا: غلام دستگیر خان

ماں کے ساتھ اس طرح کے خاص حسن سلوک اور صلہ رحمی کا حکم اللہ تعالیٰ نے کئی وجوہات کی بنا پر دیا ہے۔

(1 بچہ کو اپنے پیٹ میں رکھنے کی تکلیف اور پیدائش کے وقت کی تکلیف سہنے کی وجہ سے۔ 2) بچہ پیدا ہونے سے پہلے اور بچہ پیدا ہونے کے بعد بچے کی پرورش اور نشو نما کے لئے اس کے بدن سے بچے کو غذا دی جاتی ہے۔ 3) ہر وقت بچہ کو اپنے کاندھوں پر لادے رہنا اور دن رات اس کی ضرورتوں کے پیچھے لگے رہنا ۔4) ماں بچوں کو سکھاتی ہے اور انہیں تربیت دیتی ہے، نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بچپن کی تعلیم و تربیت کا اثر بچے کی آگے کی زندگی پر پڑتا ہے۔ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں اپنی عظیم ماؤں کی وجہ سے عظیم کہلائیں۔

سینی ٹائزر بچوں کے لیے خطرناک قرار

واضح ہے کہ ماں کے احسانات بہت زیادہ ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے حقوق کو اتنی اہمیت دی ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ کئی مائیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فوقیت اور اہمیت کا غلط استعمال کرتی ہیں، بہت ساری مائیں بچوں کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہیں اور باپ کو بچوں کے معاملات میں اپاہج بنا دیتی ہیں یہاں تک کہ ایسی مائیں بچوں کو گھریلو معاملات میں باپ کا مخالف بنا دیتی ہیں۔ جس کی بنا پر اس گھر کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسی مائیں اللہ کی دیگر ہدایات کو بھول کر ایسا کرتی ہیں، سورۃ النسائ:34

گوجرانوالہ: موٹر سائیکل سوار ملزموں کی 2 بھائیوں پر فائرنگ، ایک قتل

(ترجمہ)مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں، پس نیک عورتیں (ہوتی ہیں) اطاعت شعار۔(مردوں کی) غیر حاضری میں حفاظت کرنے والیاں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں گھریلو زندگی کے متعلق سب سے زیادہ مفصل ہدایتیں دی ہیں۔اتنی ہدایتیں زندگی کے دوسرے شعبے کے متعلق نہیں ملتیں۔کیونکہ گھریلو سکون کی اہمیت اور بقا اللہ تعالیٰ کی نظر میں بہت اہم ہے۔ایسی مائوں کا اس طرح کا غیر اسلامی سلوک ان کے شوہروں کو انتہائی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت مسائل پیدا کر دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایسی مائوں کا اجر کم ہو جاتا ہے۔کیونکہ وہ خاوند کو اسکے مقام سے گرا کر اولاد کی مدد سے گھریلو سکون کو تباہ و برباد کرتی ہیں۔کئی ایسی مائیں اپنی زندگی کے آخری حصہ میں اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیتی ہیں۔جب وہ خود اپنے پیدا کئے ہوئے مسائل میں گھِر کر پریشان ہو جاتی ہیں۔لیکن پھر اس وقت نقصان کی تلافی انتہائی مشکل ہو جاتی ہے۔

<u>بائیس سالہ نوجوان کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا</u>

حقیقت میں ہر بری چال کا نتیجہ اس چال کے چلنے والے پر ہی وارد ہو جاتا ہے ۔سورۃ الفاطر:43(ترجمہ) کسی بھی بری چال کا نتیجہ اس چال کے چلنے والے ہی کو مل کر رہتا ہے۔سورۃ الاسراء :23-24-25میں والدین کے ادب واحترام کے لئے مزید تفصیل دی گئی ہے ۔(ترجمہ)اور تیرا پروردگار صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا یہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ کہنا، نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا بلکہ ان کے ساتھ ادب و احترام سے بات چیت کرنا۔اور عاجزی اور محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کا بازو پست رکھے رکھنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار !ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے تمہارا رب بخوبی جانتا ہے اگر تم نیک ہو تو وہ تو رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے بعد دوبارہ والدین کے ادب و احترام کی بات کی ہے۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھایا ہے کہ ہم بچپن میں کس طرح بے یارو مددگار تھے اور والدین نے ہمیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا، ہمارے والدین ہماری ہر خواہش پورا کرتے تھے۔مکمل خلوص اور محبت

کے ساتھ ،اسی لئے اولاد پر فرض ہے کہ وہ والدین کا احترام کرے اور ان سے اچھا سلوک کرے۔ اگرچہ عمر کے تمام حصوں میں والدین کا ادب و احترام کرنا چاہیے لیکن ان کی طرف زیادہ تر توجہ اس وقت ہونی چاہیے جب وہ بوڑھے ہو جائیں۔ کیونکہ وہ بھی اسی طرح بے یارو مددگار ہو جاتے ہیں جیسے ہم بچپن میں تھے ،اللہ تعالیٰ ان آیات میں مندرجہ ذیل ہدایات ہمیں دی ہیں:۔ 1)والدین کو انکی بے عزتی کے طور پر چھوٹے سے چھوٹا لفظ بھی نہیں کہنا چاہئے۔2)ان کے سامنے چلا کر نہیں بولنا چاہئے۔3)انتہائی محبت بھرے لہجے اور ہمدردی کے انداز میں ان سے بات کرنی چاہئے۔4)والدین کے ساتھ ہر معاملہ انتہائی فرمانبرداری اور نرمی سے کرنا چاہئے۔ انکے ساتھ رحمدلی کا معاملہ ہونا چاہئے اور دل کی گہرائیوں سے یہ سب کچھ ہونا چاہئے ، محض دکھانے کے لئے روایتی انداز میں نہیں ہونا چاہئے۔5)ہمیں والدین کے لئے دعا کرنا چاہئے ،اے اللہ تعالیٰ میرے والدین پر رحم فرما کہ بالکل اسی طرح جس طرح وہ لوگ بچپن میں مجھ پر رحم و کرم کرتے تھے۔ یہ دعا ان کی موت کے بعد بھی کرتے رہنا چاہئے ،ہمیں اس دعا کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے ،کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود یہ دعا ہمیں سکھائی ہے ۔اور اسکی تلقین فرمائی ہے۔6)سورۃ الاسراء کی آیت نمبر25 میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی ہمارے دلاسے کے طور پر بیان کر دی ہے کہ اگر کسی سے بھول چوک یا غلطی سے والدین کے متعلق کوئی نازیبا کلمات نکل جائیں جو لاپرواہی کی وجہ سے نہیں بلکہ سخت محنت کرتے ہوئے انجانے میں ہو جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ ہمیں سزا نہ دے گا ۔بشرطیکہ ہم خلوص دل سے توبہ کرلیں اور معافی مانگ لیں ،اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کی گہرائیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

از: مفتی ابوالخیر عارف محمود، مسؤل دارالتصنیف مدرسہ فاروقیہ گلگت

اللہ رب العزت نے انسانوں کو مختلف رشتوں میں پرویا ہے، ان میں کسی کو باپ بنایا ہے تو کسی کو ماں کا درجہ دیا ہے اور کسی کو بیٹا بنایا ہے تو کسی کو بیٹی کی پاکیزہ نسبت عطا کی ہے؛ غرض رشتے بنا کر اللہ تعالی نے ان کے حقوق مقرر فرما دیے ہیں، ان حقوق میں سے ہر ایک کا ادا کرنا ضروری ہے، لیکن والدین کے حق کو اللہ رب العزت نے قرآنِ کریم میں اپنی بندگی اور اطاعت کے فوراً بعد ذکر فرمایا، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رشتوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔

والدین سے حسن سلوک کا حکم

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے: ﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا﴾.(۱)

ترجمہ: اور تیرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سواہ کسی کی عبادت مت کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آو، اگر وہ یعنی ماں باپ تیری زندگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں، چاہے ان میں ایک پہنچے یا دونوں (اور ان کی کوئی بات تجھے ناگوار گزرے تو) ان سے کبھی "ہوں" بھی مت کہنا اور نہ انھیں جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا، اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا: اے ہمارے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے (صرف ظاہر داری نہیں، دل سے ان کا احترام کرنا) تمھارا رب تمھارے دل کی بات خوب جانتا ہے اور اگر تم سعادت مند ہو تو وہ توبہ کرنے والے کی خطائیں کثرت سے معاف کرنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ جلّ جلالہُ نے سب سے پہلے اپنی بندگی و اطاعت کا حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میرے علاوہ کسی اور کی بندگی ہر گز مت کرنا، اس کے بعد فرمایا کہ اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اولاد کو یہ سوچنا چاہیے کہ والدین نہ صرف میرے وجود کا سبب ہیں؛ بلکہ آج میں جو کچھ بھی

ہوں، انھیں کی برکت سے ہوں، والدین ہی ہیں جو اولاد کی خاطر نہ صرف ہر طرح کی تکلیف دکھ اور مشقت کو برداشت کرتے ہیں؛ بلکہ بسا اوقات اپنا آرام وراحت اپنی خوشی وخواہش کو بھی اولاد کی خاطر قربان کردیتے ہیں۔

ماں کا مجاہدہ: سب سے زیادہ محنت ومشقت اور تکلیف ماں برداشت کرتی ہے، سورۂ احقاف میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾ (۲) ترجمہ: اس ماں نے تکلیف جھیل کر اسے پیٹ میں رکھا اور تکلیف برداشت کرکے اسے جنا۔ حمل کے نوماہ کی تکلیف اور اس سے بڑھ کر وضع حمل کی تکلیف، یہ سب ماں برداشت کرتی ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اب اس کی پرورش کے لیے باپ محنت ومشقت برداشت کرتا ہے، سردی ہو یا گرمی، صحت ہو یا بیماری، وہ اپنی اولاد کی خاطر کسبِ معاش کی صعوبتوں کو برداشت کرتا ہے اور ان کے لیے کما کر لاتا ہے، ان کے اوپر خرچ کرتا ہے، ماں گھر کے اندر بچے کی پرورش کرتی ہے، اس کو دودھ پلاتی ہے، اس کو گرمی وسردی سے بچانے کی خاطر خود گرمی وسردی برداشت کرتی ہے، بچہ بیمار ہوتا ہے تو ماں باپ بے چین ہوجاتے ہیں، ان کی نیندیں حرام ہوجاتیں ہیں، اس کے علاج ومعالجہ کی خاطر ڈاکٹروں کے چکر لگاتے ہیں۔ غرض والدین اپنی راحت وآرام کو بچوں کی خاطر قربان کرتے ہیں؛ اس لیے اللہ تعالی نے جہاں اپنا شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے وہیں والدین کی شکر گزاری کا بھی حکم ارشاد فرمایا ہے، سورۂ لقمان میں اللہ تعالی فرماتے ہیں: ﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾ (۳) ترجمہ: کہ میرا شکریہ ادا کرو اور اپنے والدین کا شکریہ ادا کرو، میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ میں نے خراسان سے اپنی والدہ کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور بیت اللہ لایا اور اسی طرح کندھے پر اٹھا کر حج کے مناسک ادا کروائے، کیا میں نے اپنی والدہ کا حق ادا کردیا؟ تو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "نہیں ہرگز نہیں، یہ سب تو ماں کے اس ایک چکر کے برابر بھی نہیں جو اس نے تجھے پیٹ میں رکھ کر لگایا تھا۔

اللہ تعالی نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ یعنی ان کے ساتھ انتہائی تواضع وانکساری اور اکرام واحترام کے ساتھ پیش آئے، بے ادبی نہ کرے، تکبر نہ کرے، ہر

حال میں ان کی اطاعت کرے، اِلّا یہ کی وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو پھر ان کی اطاعت جائز نہیں۔ سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے: ﴿وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا وَاِنْ جَاهَدَاکَ لِتُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (۴) ترجمہ: ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور ساتھ یہ بھی بتادیا ہے کہ اگر وہ تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرے شریک ٹھہرائے جس کے معبود ہونے کی کوئی دلیل تیرے پاس نہ ہو تو ان کا کہنا مت ماننا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا فرمان: حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کس طرح کیا جائے؟ تو انھوں نے فرمایا: تو ان پر اپنا مال خرچ کر، اور وہ تجھے جو حکم دیں اس کی تعمیل کر، ہاں اگر گناہ کا حکم دیں تو مت مان۔ (۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک میں سے یہ بھی ہے کہ تم ان کے سامنے اپنے کپڑے بھی مت جھاڑو، کہیں کپڑوں کا غبار اور دھول ان کو لگ نہ جائے۔

بڑھاپے میں حسنِ سلوک کا خصوصی حکم: اللہ تعالی نے خاص طور سے والدین کے بڑھاپے کو ذکر فرما کر ارشاد فرمایا کہ اگر ان میں کوئی ایک، یا دونوں تیری زندگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو "اف" بھی مت کہنا اور نہ ان سے جھڑک کر بات کرنا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں "اف" کا ترجمہ "ہوں" سے کیا ہے کہ اگر ان کی کوئی بات ناگوار گزرے تو ان کو جواب میں "ہوں" بھی مت کہنا۔ اللہ رب العزت نے بڑھاپے کی حالت کو خاص طور سے اس لیے ذکر فرمایا کہ والدین کی جوانی میں تو اولاد کو نہ "ہوں" کہنے کی ہمت ہوتی اور نہ ہی جھڑکنے کی، جوانی میں بدتمیزی اور گستاخی کا اندیشہ کم ہوتا ہے؛ البتہ بڑھاپے میں والدین جب ضعیف ہوجاتے ہیں اور اولاد کے محتاج ہوتے ہیں تو اس وقت اس کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔، پھر بڑھاپے میں عام طور سے ضعف کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن اور جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے، بعض دفعہ معمولی باتوں پر بھی والدین اولاد پر غصہ کرتے ہیں، تو اب یہ اولاد کے امتحان کا وقت ہے کہ وہ اس کو برداشت کرکے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں، یا ناک بھوں چڑھا کر بات کا جواب دیتے ہیں، اس موقع کے لیے اللہ تعالی نے یہ حکم دیا ہے کہ جواب دینا اور جھڑک کر بات کرنا تو دور کی بات ہے، ان کو "اف" بھی مت کہنا اور ان کی بات پر معمولی سی ناگواری کا اظہار بھی مت کرنا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر والدین کی بے ادبی میں " اف " سے کم درجہ ہوتا تو بھی اللہ جلّ شانہٗ اُسے بھی حرام فرمادیتے۔(۶)

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا قول: حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر والدین بوڑھے ہو جائیں اور تمھیں ان کا پیشاب دھونا پڑجائے تو بھی " اف " مت کہنا کہ وہ بچپن میں تمہارا پیشاب پاخانہ دھوتے تھے۔(۷)

والدین کا ادب: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ بوڑھا کون ہے؟ اس شخص نے جواب میں کہا کہ یہ میرا باپ ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: لَاتَمْشِ اَمَامَہ، وَلَاتَقْعُدْ قَبْلَہ، وَلَاتَدْعُہٗ بِاسْمِہٖ، وَلَاتَسْتَبَّ لَہ).۸) یعنی ان کے آگے مت چلنا، مجلس میں ان سے پہلے مت بیٹھنا، ان کا نام لے کر مت پکارنا، ان کو گالی مت دینا۔

بڑھاپے میں جب والدین کی کوئی بات ناگوار گزرے تو ان سے کیسے گفتگو کی جائے، اس کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿ وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾(۹) یعنی: ان سے خوب ادب سے بات کرنا، اچھی بات کرنا، لب ولہجہ میں نرمی اور الفاظ میں توقیر و تکریم کا خیال رکھنا۔ قول کریم کے بارے میں حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے فرمایا: خطار کار اور زر خرید غلام سخت مزاج اور ترش روی آقا سے جس طرح بات کرتا ہے، اس طرح بات کرنا قول کریم ہے(۱۰)۔

آگے فرمایا: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ یعنی ان کے سامنے شفقت کے ساتھ انکساری سے جھکتے رہنا۔ حضرت عروہ رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ اللہ نے قران میں والدین کے سامنے جھکے رہنے کا حکم دیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ اگر وہ کوئی بات تیری ناگواری کی کہیں تو ترچھی نگاہ سے بھی ان کو مت دیکھ کہ آدمی کی ناگواری اول اس کی آنکھ سے پہچانی جاتی ہے۔(۱۱) اور فرمایا کہ ان کے سامنے ایسی روش اختیار کر کہ تیری وجہ سے ان کی دلی رغبت پوری کرنے میں فرق نہ آئے اور جس چیز کو والدین پسند کریں تو وہ ان کی خدمت میں پیش کرنے میں کنجوسی مت کرنا۔(برالوالدین، ص: ۴۰)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ والدین کی خدمت و اطاعت کا حکم کسی زمانے و عمر کے ساتھ مقید نہیں، بہر حال ہر عمر میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا واجب ہے؛ کیونکہ والدین کی خدمت اور ان کی رضا مندی میں اللہ تعالی کی رضامندی ہے اور ان کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی ہے۔(۱۲)

اللہ تعالی کی رضا و ناراضگی: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رضا اللّٰہ مع رضا الوالدین و سخطُ اللّٰہِ مع سخطِ الوالدین. (۱۳) یعنی اللہ کی رضا مندی والدین کی رضا مندی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی ماں باپ کی ناراضگی میں ہے۔

جنت یا جہنم کے دروازے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ أَصْبَحَ مُطِیْعًا فِي وَالِدَیْہِ أَصْبَحَ لَہ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ الْجَنَّۃِ، وَانْ کَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا، وَمَنْ أَمسیٰ عَاصِیًا للّٰہ فِی وَالِدَیْہِ أَصْبَحَ لَہ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ النَّارِ، وَانْ کَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا، قال الرجلُ: وانْ ظَلَمَاہُ؟ قال: وانْ ظَلَمَاہُ، وانْ ظَلَمَاہُ، وان ظلماہ. (۱۴)

یعنی جس شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ اپنے والدین کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اللہ کا فرمانبردار رہا تو اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں اور اگر والدین میں سے ایک زندہ ہو اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرے تو جنت کا ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اور جس نے اپنے والدین کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ کی نافرمانی کی، اس کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق حسنِ سلوک نہ کیا تو اس کے لیے جہنم کے دو دروازے کھلے رہتے ہیں اور اگر والدین میں ایک زندہ ہو اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرے تو جہنم کا ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ اے اللہ کے نبی! اگرچہ ماں باپ نے اس پر ظلم کیا ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ فرمایا: اگرچہ والدین نے ظلم کیا ہو۔

حضرت رفاعہ بن ایاس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ رونے لگے، کسی نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو؟ تو انھوں نے فرمایا: کَانَ لِيْ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ الی الجنَّۃِ وَ أُغْلِقَ أَحدُہما یعنی میرے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوئے تھے، اب ایک (والدہ کی وفات پر) بند ہو گیا ہے؛ اس لیے رو رہا ہوں۔ کس قدر خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے والدین زندہ ہیں اور وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتے ہیں اور ان کے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

والدین کے لیے دعا کا اہتمام کرنا: اللہ تعالی نے جہاں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے وہیں پر ان کے لیے دعا کرنے کی تعلیم بھی ارشاد فرمائی ہے؛ چناں چہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ (۱۵) یعنی: اے میرے پروردگار! تو میرے والدین پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے بچپن میں (رحمت و شفقت کے ساتھ) میری پرورش کی ہے۔ ہر نماز کے بعد والدین کے لیے دعا کرنے کا معمول بنالیں، دو بہت آسان دعائیں جن کی تعلیم خود اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم میں دی ہے، ایک ما قبل والی اور دوسری یہ: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ (۱۶) یعنی اے میرے پروردگار! روز حساب تو میری، میرے والدین کی اور تمام ایمان والوں کی بخشش فرما۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے فرمایا: مَنْ صَلَّى الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ فَقَدْ شَكَرَ اللّٰهَ، وَمَنْ دَعَا لِلْوَالِدَيْنِ فِيْ أَدْبَارِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ فَقَدْ شَكَرَ الْوَالِدَيْنِ. (۱۷) یعنی جس نے پانچ وقت کی نماز کی ادائیگی کا اہتمام کیا تو گویا اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جس نے پانچ نمازوں کے بعد والدین کے لیے دعائے خیر کی تو گویا اس نے والدین کا شکر ادا کیا۔ اولاد کی دعا سے والدین کے درجات بلند ہوتے ہیں، حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ جب حضرت موسی علیہ السلام اللہ کی ملاقات کے لیے گئے تو وہاں عرش کے سائے تلے ایک شخص کو دیکھا اور اس کی حالت اتنی اچھی تھی کہ خود موسی علیہ السلام کو اس آدمی پر رشک آیا تو موسی علیہ السلام نے اللہ تعالی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا کہ اے اللہ! تیرا یہ بندہ کون ہے؟ اللہ تعالی نے فرمایا: كَانَ لَا يَحْسُدُ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ، وَكَانَ لَا يَعُقُّ وَالِدَيْهِ، وَلَا يَمْشِيْ بِالنَّمِيْمَةِ. (۱۸) یعنی یہ شخص تین کام کرتا تھا (۱) جو چیزیں میں نے اپنے فضل و کرم سے لوگوں کو نعمتیں عطا کی ہیں ان پر حسد نہیں کرتا تھا (۲) والدین کی نافرمانی نہیں کرتا تھا (۳) چغل خوری نہیں کرتا تھا۔

رزق میں اضافہ: والدین کے ساتھ حسن سلوک رزق و عمر میں اضافہ کا سبب ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یعنی جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی عمر دراز کر دے اور رزق میں اضافہ فرمائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے (۱۹)۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بَرُّوْا آبَاءَكُمْ تَبَرَّكُمْ أَبْنَاؤُكُمْ. (۲۰) یعنی تم اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو تمہاری اولاد تمھارے ساتھ حسن سلوک کرے گی۔

موت کے بعد والدین سے حسن سلوک کا طریقہ: والدین یا ان میں کوئی ایک فوت ہو جائیں اور زندگی میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک میں کوتاہی ہوئی ہو تو اس کے تدارک کا طریقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا۔ حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ ماں باپ کی وفات کے بعد بھی کوئی چیز ایسی ہے جس کے ذریعے ان سے حسن سلوک کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نَعَم، اَلصَّلاۃُ عَلَیۡہِمَا، وَالاِسۡتِغۡفَارُ لَہُمَا، وَاَنۡفَاذُ عَہۡدِہِمَا مِنۡ بَعۡدِہِمَا، وَصِلَۃُ الرَّحِمِ الَّتِیۡ لاَتُوۡصَلُ الاّٰبِہِمَا، وَاَکۡرَامُ صَدِیۡقِہِمَا. (۲۱) ہاں! ان کے لیے رحمت کی دعا کرنا، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنا، ان کے بعد ان کی وصیت کو نافذ کرنا اور اس صلہ رحمی کو نبھانا جو صرف ماں باپ کے تعلق کی وجہ سے ہو، ان کے دوستوں کا اکرام کرنا۔ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ جب مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ان سے ملنے کے لیے آئے اور پوچھا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، تو فرمایا: میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: مَنۡ اَحَبَّ اَنۡ یَصِلَ اَبَاہُ فِی قَبۡرِہٖ فَلۡیَصِلۡ اِخۡوَانَ اَبِیۡہِ بَعۡدَہٗ. (۲۲) یعنی جو یہ چاہتا ہے کہ اپنے باپ کے ساتھ قبر میں صلہ رحمی کرے تو اس کو چاہیے کہ ان کے بعد ان کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے، میرے والد عمر رضی اللہ عنہ اور تمہارے والد کے درمیان دوستی تھی میں نے چاہا کہ میں اسے نبھاوں (اس لیے تم سے ملنے آیا ہوں)۔

آخر میں گزارش کہ جن کے والدین دونوں یا ان میں سے کوئی ایک باحیات ہوں تو ان کو اللہ کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر ان کی فرمانبرداری کرے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، جتنا ہو سکے ان کی خدمت کرے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرے اور جن کے والدین دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں تو ان کے ساتھ اب حسن سلوک یہ ہے کہ ان کی وصیت کو نافذ کرے، ان کے ذمہ کوئی قرضہ ہو تو اسے ادا کرے، شرعی حصص کے مطابق میراث کو تقسیم کرے، خود دینی تعلیم حاصل کرے اور اس پر عمل کرے، ان کے لیے دعا کرے، اللہ سے ان کے لیے رحمت و مغفرت طلب کرے، ان کی طرف سے صدقہ کرے، ان کی طرف سے نفلی حج و عمرہ کرے، کہیں کنواں کھدوائے یا لوگوں کے پینے کے پانی کا انتظام کرے، دینی کتابیں خرید کر وقف کرے، مسجد بنوائے، مدرسہ بنوائے یا دینی علم حاصل کرنے والے مہمانانِ رسول کی ضروریات کو پورا کرنے میں تعاون

کرے، والدین کے قریبی رشتہ داروں اور تعلق والوں کے ساتھ حسن سلوک کرے، نفلی اعمال کر کے ان کے لیے ایصالِ ثواب کرے، اپنے علاقہ، ملک اور دنیا بھر میں مظلوم مسلمانوں کی حالتِ زار کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے مال کے ساتھ ان کی خبر گیری کرے، اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی توفیق سے نوازے، آمین، ثم آمین۔

شجر کاری کی اہمیت اور ضرورت پر مضمون

شجر کاری کی ضرورت اور اہمیت

ایک دو پیڑ ہی سہی، کوئی خیاباں نہ سہی
اپنی نسلوں کے لئے کچھ تو بچایا جائے

شجر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی درخت یا پیڑ کے ہیں۔ کار کے معنی "کام کرنے کے ہیں" اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شجر کاری سے مراد "درخت لگانے کا کام " ہے جس کو انسان اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا ہے ۔ عالمِ ارواح سے ہی آدم اور درخت کا رشتہ چلا آ رہا ہے ۔ حضرتِ آدم کو شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی وجہ سے ہی جنت سے بے دخل کیا گیا تھا ۔ اس لیے درخت شروع ہی سے انسان کے دوست ہیں ۔ شجر کاری نا صرف سنتِ رسول ﷺ ہے بلکہ ماحول کو خوبصورت اور دلکش بنانے کے ساتھ ساتھ زمین کی زرخیزی میں معاون و مدگار ہے ۔ روح ارضی پر درخت زندگی کے ضامن ہیں۔

تم نے دیکھا ہے کبھی اک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد

شجر سے محبت انسانیت سے محبت ہے، کیونکہ یہ درخت آکسیجن مہیا کر کے ہماری زیست کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ درختوں کی کٹائی اور کمی سے گلوبل وارمنگ کے خطرات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں زیرِ زمین پانی کی سطح کم ہو رہی ہے اور پینے کے صاف پانی کے ناپید ہونے کے باعث پوری نوع انسانی شدید خطرات سے دور چار ہونے جا رہی ہے ۔ درجہ حرارت کے بڑھنے سے پہاڑوں سے برف تیزی سے پگھلنے لگی ہے جس سے سمندروں کی سطح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور مستقبل میں طغیانی سے شہروں کے شہر زیر آب آنے کے خدشات ظاہر کیے ہیں ۔ اس لیے اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں میں درختوں کی ضرورت اور اہمیت سے متعلق شعور کو بیدار کیا جائے اور ان کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا جائے۔

لیکن افسوس صد افسوس ہے پوری دنیا سے درختوں کی مسلسل کٹائی کی وجہ سے ماحولیاتی آلودگی کے آسیب نے آج ہمیں جکڑ رکھا ہے ماحولیاتی آلودگی کے علاج کی دوا ، یعنی جنگلات کی کٹائی انسان کی خود غرضی و مفاد پرستی کی تلوار سے بڑی بے دردی سے کی جا رہی ہے۔ جنگلات کی بے رحمی سے کٹائی کی صورتحال اگر یہی رہی تو ہمیں 2080ء تک ؛ سدابہار درختوں سے محروم ہونا پڑے گا ۔

اس راستے میں جب کوئی سایہ نہ پائے گا
یہ آخری درخت بہت یاد آئے گا

اقوام متحدہ کے ایک محتاط جائزے کے مطابق ہر سال تقریبا تیرہ ملین ہیکٹر رقبے پر پھیلے جنگلات کا صفایا ہو رہا۔ جیسے جیسے جنگلات کی کٹائی جاری ہے ویسے ویسے سیلاب ، آندھی اور طوفان اور دیگر آفات کی تعداد میں بھی بے تحاشا اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے اور اس کے ساتھ انسان مہلک امراض اور وباؤں کا شکار ہونے لگے ہیں۔

اس وقت پاکستان جس حد تک ماحولیاتی آلودگی اور موسمی تغیرات کا شکار ہے اس صورتحال میں تو شجرکاری مہم کو سال میں بارہ مہینے چلنا چاہئیے تاکہ جلد از جلد ان بڑھتے ہوئے ماحولیاتی مسائل پر قابو پایا جاسکے۔

بون چیلنج جو کہ ایک عالمی معاہدہ ہے جس کے تحت دنیا کے درجنوں ممالک نے 2020ء تک 150 ملین ایکڑ اور 2030ء تک 350 ایکڑ رقبے پر جنگلات میں اضافے کا عیادہ کیا ہے۔ خوش قسمتی سے پاکستان بھی بون چیلنج معاہدے کا حصہ ہے اور ماحولیاتی تبدیلیوں کی روک تھام کے لیے کوششوں میں اپنا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنے اور درختوں کو کاٹنے کے لیے حکومتی اجازت کو لازم قرار دینے کے حوالے سے قانون سازی بھی کی جارہی ہے۔

کل رات جو ایندھن کے لئے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بہت پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

مقامِ افسوس ہے کہ گذشتہ ادوار میں شجرکاری کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی یہ جانتے ہوئے بھی کہ درختوں کی موجودگی فضائی آلودگی کو ختم کرتی ہے اور فضا میں آکسیجن کی مقدار میں اضافہ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ میں کمی کا باعث بنتی ہے اور ہماری آنے والی نسلوں کے روشن مستقبل کی نوید بھی ہے۔ اگر صرف سندھ اور بلوچستان کی زمین پر زیتون کے دو ملین درخت لگا دیئے جائیں جو کہ زیتون کی پیداوار کے لیے سب سے بہترین خطہ ہے تو پاکستان سپین کی زیتون کی بلین ڈالر انڈسٹری کا مقابلہ کر سکتا۔

ایک رپورٹ کے مطابق افغانستان کے بعد پاکستان خطے کے کم ترین جنگلات والا ملک ہے اس کا صرف 4 فیصد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے حالانکہ اس کے پڑوس میں موجود ممالک میں ایران 7 فیصد، بھارت کا 23 فیصد، چین 22 فیصد اور روس کا 44 فیصد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شجرکاری کی اہمیت اور افادیت کا ذکر قرآن کریم میں چودہ سو سال قبل ہی کر دیا تھا قرآن کریم میں مختلف حوالے سے مختلف شجر کا ذکر آیا ہے مثلاً کھجور، زیتون اور بیری۔ اللہ تعالیٰ نے درختوں کو اپنی رحمت قرار دیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

جو شخص درخت لگائے اس کے بعد اس کی نگہداشت، حفاظت اور نگرانی کر کے مکمل پھل دار درخت کی

صورت میں بڑا کر دے تو اس کے لیے بہت ثواب ہے۔ اور یہ صدقہ جاریہ بن جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

” مسلمان کوئی درخت یا کھیتی لگائے، اور اس میں سے کوئی انسان، درندہ، پرندہ، یا چوپایہ کھائے تو وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

“قیامت برپا ہو رہی ہو، اور تمہیں درخت لگانے کی نیکی کا موقعہ مل جائے، تو فوراً نیکی کر ڈالو“۔

اسلامی نکتہ نظر سے کھیتوں اور پودوں کو برباد کرنا منافقین کا شیوہ ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں درختوں کو زمین کی زینت قرار دیا ہے۔ درختوں اور پودوں کی وجہ سے آسمان سے

پانی برستا ہے، درختوں سے جان داروں کو آکسیجن ملتی ہے، اور ہواؤں میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اور درجہ حرارت میں کمی آتی ہے۔بقول شاعر:

جس پیڑ کے سائے میں تھکن دور ہو میری
سوکھا ہی سہی وہ، مجھے درکار وہی ہے

-

چند درخت ایسے بھی ہیں کہ جن کا کوئی فائدہ نہیں اور ان کی کاشت پر پابندی لگنی چاہیے۔ مثلاً

- "سنبل" کے درخت جو زمین سے ہزاروں گیلن پانی چوس لیتے ہیں۔ ماسوائے ماچس کی تیلیاں بنانے کے اور کوئی کام ان سے نہیں لیا جاتا۔
- "سفیدہ" کے درخت سیم و تھور کو تو ختم کرسکتے ہیں لیکن زرعی زمین کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں کیونکہ ایک سفیدہ ایک دن میں 25 لیٹر پانی پیتا ہے۔لہٰذا جہاں زیرزمین پانی کم ہو اور فصلیں ہوں وہاں سفیدہ نہ لگائیں۔
- "الٹا شوخ "کا درخت بھی کوئی خاص افادیت کا حامل نہیں ہے اس کو عام طور پر گھروں میں؛ پارکوں میں؛ لان اور پبلک مقامات اور سکولوں میں خوبصورتی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔یہ بھی زیرزمین پانی کے لیے خطرناک ہے۔
- "کونوکارپس" کے درخت بھی نہ لگائے جائیں کیونکہ یہ درخت پولن الرجی کا باعث بنتے ہیں۔

ماحولیاتی کثافتوں کو دور کرنے کے لیے جنگلات کی صورت، میں سرسبز اور شاداب ماحول کا ہونا بہت ضروری ہے۔موجودہ جدید ترین سائنس کے مطابق درخت لگانے کے 60مثبت فوائد دریافت کئے گئے ہیں۔ ان فوائد میں مندرجہ ذیل اہم ہیں۔

- ایک درخت 18افراد کی ایک سال کی آکسیجن کی ضرورت پوری کرتا ہے۔
- درختوں کی لکڑی سے غریب لوگوں کے ایندھن کے علاوہ انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کی خوراک پوری ہو جاتی ہے۔

- درخت لگانے سے سیلاب کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔
- درخت قحط اور خشک سالی سے بچاتے ہیں۔
- درخت بادلوں کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔
- درخت ڈیپریشن اور ذہنی تناؤ کا خطرہ کم کرتے ہیں۔
- درخت دیہی علاقوں میں سائے کا ایک مستقل ذریعہ ہیں۔
- درخت ماحول میں خوبصورتی پیدا کرتے ہیں
- درخت آکسیجن فراہم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔
- درخت درجہ ٔحرارت کو اعتدال و توازن میں رکھنے کے لیے معاون ومددگار بنتے ہیں۔
- درخت فضائی جراثیم کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔
- درخت انسانوں اور حیوانات کی غذائی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔
- درخت چرندوں، پرندوں اور متعدد حیوانات کا مسکن بھی ہیں ۔
- درخت ادویات کا سب سے بڑا منبع ہیں ۔
- مختلف قسم کے درخت ریگستان کو نخلستان میں بدل دیتے ہیں
- درختوں کی کمی کی وجہ سے ہمارے ہاں گرمی کی شدت اور دورانیے میں اضافہ ہو تا جا رہا ہے۔
- درختوں کی کمی پہاڑوں پر لینڈ سلائیڈنگ کا باعث بنی ہے ۔

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے

پاکستان میں شجر کاری کے لئے بہار اور برسات کا موسم موزوں ہے۔ جس کے دوران ملک بھر میں کروڑوں پودے لگائے جاتے ہیں۔ شجر کاری کی اس مہم میں ہر مکتبہ فکر اور ہر شعبہ زندگی کے لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ہر سال سرکاری سطح پر اربوں روپے کے پودے لگائے جاتے ہیں لیکن پودے لگانے کے بعد ان کی حفاظت نہ ہونے کی وجہ سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو پاتے اور 70 فیصد سے زائد پودے نشوونما ہی نہیں پاتے۔

پچیس سے تیس سال پہلے میدان عرفات کے ریتلے میدان میں نیم کے ہزاروں درخت لگائے گئے جو کہ ریتلی زمین کے لیے موزوں نہیں تھے لیکن پھر بھی مٹی اور وافر پانی پہنچا کر ان درختوں کی آبیاری کی گئی اور ایک پُر فضا مقام بنا کر حجاج کرام کے لیے آسانیاں پیدا کی گئیں ہیں۔ حکومت سعودیہ نے ان نیم کے درختوں کی پوری حفاظت کی ہے۔ اور ان کی دیکھ بھال کیلئے مستقل محکمہ تشکیل دیا ہوا ہے جو اپنا کام نہایت دیانتداری سے سرانجام دے رہا ہے۔

سعودی عرب کی طرح ہمیں بھی شجرکاری سے پہلے ہمیں اپنے علاقے کی آب و ہوا سے روشناس ہونا ضروری ہے۔ تاکہ کما حقہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس کے لیے میرے پاس چند تجاویز ہیں۔

- جنوبی پنجاب میں اس کی خشک آب و ہوا کو برداشت کرنے والے پودے مثلا! بیری، سوہانجنا، کیکر، کھجور اور آم کے درخت لگائے جائیں۔
- وسطی پنجاب کا زیادہ تر علاقہ نہری ہے ان علاقوں میں شیشم، جامن، توت، سمبل، پیپل، بکائن، ارجن اور لسوڑا لگایا جانا چاہیئے۔
- شمالی پنجاب کا علاقہ ٹھنڈا اور بارشوں کا مسکن ہے اس لیے ان علاقوں میں کچنار، کیلا، اخروٹ، بادام اور دیودار کے درخت لگائے جائیں۔
- اسلام آباد، سطح مرتفع اور خطہ پوٹھوہار کے لئے موزوں درخت دلو، کچنار، بیری اور چنار ہیں۔

اب وقت آ چکا ہے کہ ہم انفرادی طور پر اس شجرکاری مہم میں حصہ لیں درخت نہ صرف لگائیں بلکہ اس کی حفاظت بھی کریں، اگر جنگلات میں اضافہ نہیں کرسکتے تو اپنے طور پر درختوں اور پودوں میں اضافہ کریں اپنے محلے اور گلی کوچوں کو سرسبز وشاداب بنائیں۔ کیونکہ درخت ہی ہماری بقا کے لیے ضروری ہیں بقول شاعر:

کوئی بھی رُت ہو چمن چھوڑ کر نہیں جاتے
چلے بھی جائیں پرندے، شجر نہیں جاتے

پاکستان میں مقامی درخت لگائے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ پاکستان میں درخت لگانے کا بہترین وقت فروری مارچ اگست اور ستمبر کے مہینے ہیں اگر آپ بھی درخت لگانا چاہتے ہیں تو درخت ہمیشہ ایک قطار میں لگائیں اور ان کا آپس کا فاصلہ دس سے پندرہ فٹ ضرور ہونا چاہیے۔ گھر میں درخت لگاتے وقت دیوار سے دور لگائیں۔اان تجاویز پر عمل کر کے ہم بھی شجر کاری مہم کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔۔ آئیں ہم سب مل کر کوشش کریں اور اپنے اپنے حصے کا چراغ روشن کریں اور اپنی ذمے داری پوری کریں اور اپنے ملک اور دنیا کو محفوظ بنائیں۔ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کے تعلیمی نصاب میں درختوں کی اہمیت اور افادیت کو سلیبس کا حصہ بنانا پڑے گا تاکہ وہ بھی ایک شجر سایہ دار کی مانند ہر شجر پر سایہ فگن ہوں اور ہمارا مستقبل تابناک ہو سکے۔ آمین

ہم تو محروم ہیں سایوں کی رفاقت سے مگر
آنے والوں کے لئے پیڑ لگا دیتے ہیں

شجر کاری، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

اسلام دین فطرت ہے اور دین اسلام محض عقائد و عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بل کہ یہ ایک مکمل اور جامع نظام حیات ہے۔

اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر رخ کے لیے ابدی ہدایات اور احکام موجود ہیں، ان احکام کی روشنی میں جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے اسے حسن کردار کا مظہر، انفرادیت اور اجتماعیت کا نہایت حسین امتزاج کہا جاسکتا ہے۔ اسلامی تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی معاشرے اور ماحول کی اصلاح کرنا ہے، کیوں کہ ماحول کا اثر انسان کی جسمانی بناوٹ، رہائش، طرز حیات، غذا اور دیگر سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زمین پر فساد کی ممانعت فرمائی ہے تاکہ ماحول کو ہر طرح کے شر و فساد سے بچایا جاسکے۔ کیوں کہ ماحول کی بہتری میں انسانی زندگی کی بہتری پنہاں ہے۔ آج ہمارا ماحول مختلف قسم کی آلودگی میں گھرا ہوا ہے جس کی وجوہات صنعتوں اور کارخانوں سے اٹھنے والا دھواں، جنگلات کی کٹائی ہیں۔

اس کے علاوہ قابل ذکر جنگلات کی اندھا دھند کٹائی نے نہ صرف ماحول کو مسموم کیا بل کہ موسموں کی ترتیب کو بھی متاثر کیا۔ موسمی تبدیلی کی وجہ سے مجبوراً ہجرت، صحت کے مسائل، خوراک کے مسائل، جنگلی حیات کا ناپید ہونا، صاف پانی کی قلّت، معاشی مسائل، گلوبل وارمنگ اور دیگر مسائل بھی جنم لے رہے ہیں۔ جس کے لیے عالمی تنظیمیں رقوم کے خرچ کرنے کے علاوہ وہ ذرائع بھی استعمال کر رہی ہیں جس کے ذریعے گلوبل وارمنگ، ہیٹ اسٹروک اور اس جیسے دیگر مسائل سے نمٹا جاسکے۔ ان مسائل سے ماحول کو دور رکھنے کے لیے شجر کاری کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

انسانی جسم میں جس طرح پھیپھڑے اہمیت رکھتے ہیں اسی طرح زمین پر درختوں کی اہمیت ہے۔ درخت قدرتی فضائی فلٹر کا کام کرتے ہیں جس کے ذریعے ہوا کو صاف بنانا ممکن ہے، صرف ایک مربع میل پر پھیلے ہوئے درخت موسمِ سرما کے ایک دن میں 29 ٹن آکسیجن خارج کرتے ہیں جب کہ ایک صحت مند آدمی کو دن میں صرف دو پونڈ آکسیجن درکار ہوتی ہے جہاں درخت ماحول کی خُوب صورتی کا سبب بنتے ہیں، وہاں

ہوا کو صاف رکھنے طوفانوں کا زور کم کرنا، آبی کٹاؤ روکنے، آکسیجن میں اضافے اور آب و ہوا کے توازن بر قرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ایک بڑا درخت 36 بچوں کو آکسیجن مہیا کرتا ہے جب کہ دس بڑے درخت ایک ٹن ایئر کنڈیشنر جتنی ٹھنڈک پیدا کرتے ہیں اور ساتھ ہی فضائی آلودگی اور شور کم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے آج سے 1400 سال پہلے جب نہ تو گاڑیوں کا وجود تھا نہ دیو ہیکل کارخانے وجود میں آئے تھے نہ جنگلات فنا ہو رہے تھے اور نہ ہی دریا زہر اگل رہا تھا، اس وقت آپ ﷺ نے ماحول کو پاک و صاف رکھنے اور فضا کو آلودگی سے محفوظ کرنے کی تعلیم و تلقین، اصولی ہدایات اور عملی اقدامات تینوں طرح سے ماحول کی پاکیزگی کو یقینی بنایا تاکہ انسان خود بھی ماحول کی پاکیزگی سے لطف اندوز ہو سکے اور دوسرے جان داروں کو بھی راحت پہنچا سکے۔

محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے شجر کاری کو فروغ دینے کے لیے ایمان والوں پر شجر کاری کو صدقہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو مسلمان دَرخت لگائے یا فَصل بوئے پھر اس میں سے جو پرندہ یا اِنسان یا چوپایا کھائے تو وہ اس کی طرف سے صَدَقہ شُمار ہو گا۔“ (صحیح البخاری)

آپ ﷺ نے شجر کاری کو اتنی اہمیت دی کہ اس عمل کو یہ کہتے ہوئے قیامت تک جاری رکھنے کا حکم فرمایا کہ اگر قیامت کی گھڑی آجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں پودا ہے اور وہ اس کو لگا سکتا ہے تو لگائے بغیر کھڑا نہ ہو۔ (مسند احمد)

آپ ﷺ کی تعلیمات میں نا صرف درخت لگانے کے متعلق احکامات ملتے ہیں بل کہ درخت لگا کر اس کی حفاظت کے بھی واضح احکامات ملتے ہیں کہ جو کوئی درخت لگائے پھر اس کی حفاظت اور نگرانی کرتا رہے یہاں تک کہ وہ درخت پھل دینے لگے اب اس درخت کا جو کچھ نقصان ہو گا وہ اس کے لیے اللہ کے یہاں صدقہ کا سبب ہو گا۔ (مسند احمد)

عرب میں بالعموم ببول یا بیری کے درخت ہوا کرتے تھے، نبی کریم ﷺ نے بیری کے درخت کے بارے میں فرمایا: ”جو بیری کا درخت کاٹے گا، اسے اللہ تعالیٰ اوندھے مُنہ جہنم میں ڈالیں گے۔“ (سنن ابو داؤد)

آپ ﷺ نے جہاں عام دنوں میں درخت کاٹنے کی ممانعت فرمائی وہاں دورانِ جنگ بھی، نہروں کو آلودہ کرنے کی اور درختوں کو کاٹنے کی ممانعت فرما کر نا صرف آبی ذخائر کی حفاظت کی تعلیم دی بل کہ ماحول کو آلودہ ہونے سے بھی بچایا۔ سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ جب اسلامی لشکر کو مشرکین کی طرف روانہ فرماتے تو یوں ہدایات دیتے: ''کسی بچے کو قتل نہ کرنا، کسی عورت کو قتل نہ کرنا، کسی بوڑھے کو قتل نہ کرنا، چشموں کو خشک وویران نہ کرنا، درختوں کو نہ کاٹنا۔'' (بیہیقی)

درج بالا احادیث کی روشنی میں شجر کاری کو فروغ دینے کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ شجر کاری نا صرف ایک صدقہ و ثواب کا ذریعہ ہے بل کہ اس کے ذریعے گلوبل وارمنگ اور ہیٹ اسٹروک جیسے سنگین مسائل سے بھی نمٹا جاسکتا ہے۔

تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ اگر گلوبل وارمنگ کو روکا نہیں گیا تو یہ دنیا کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتی ہے اور اس کا حل ہے تو صرف شجر کاری۔ شجر کاری سے گلوبل وارمنگ کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس! آج بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلی ہیں۔ آج بھی ہم نے شجر کشی کو بے رحمی سے جاری رکھا ہوا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ درخت لگائے جائیں، ان کی دیکھ بھال کی جائے اور آنے والی نسل کو بھی شجر کاری کے فوائد اور اہمیت سے واقف کرایا جائے اور نسل انسانی کے دائمی تحفظ کے لیے نا صرف ایک دن بل کہ پورا سال شجر کاری مہم کا جاری رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شجر کاری کی اہمیت، ضرورت اور فضیلت

تحریر: حافظ عبد الاعلیٰ درانی۔ بریڈ فورڈ

موسم برسات شروع ہوتے ہی حکومت پاکستان شجر کاری مہم شروع کر دیتی ہے جو بہت مناسب بلکہ ضروری ہے۔ علامہ اقبال نے بال جبریل میں تاریخ المقری کے حوالے سے لکھا ہے کہ خلیفہ عبد الرحمن اول نے اسپین کے علاقے "مدینۃ الزھرا" میں سب سے پہلا کھجور کا ایک درخت بغداد سے لے جا کر لگایا تھا۔ جو اتنا پھلا پھولا کہ صدیاں گزر گئیں لیکن اندلس سے وہ کھجور کا درخت ناپید نہیں ہوا بلکہ اسپین کھجوروں کی پروڈکشن میں ایک معتبر نام رکھتا ہے اور پورا یورپ کھجوروں کی مٹھاس سے آشنا ہے اور یہاں کی کھجور معیار کے لحاظ سے عالمی منڈی میں مشہور ہے۔ گویا یورپ میں کھجور کا درخت پہچانے کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھتا ہے۔ درخت لگانا جہاں زمینی ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کیلئے بہت فائدہ مند ہے وہاں انسانیت کی خدمت کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ کار ثواب بھی ہے، بہترین صدقہ جاریہ بھی ہے۔ زمینی ماحول کو صاف ستھرا اور خوشبودار کرنا، جہاں انسانوں کیلئے فائدہ مند ہے وہاں زیادہ بارشوں کا قدرتی ذریعہ بھی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ دنیا میں اتنے لمبے لمبے اور بڑے بڑے صحرا کیوں نظر آتے ہیں۔ وہاں کی حکومتیں ان صحراؤں میں کھجور اور خودرو درخت لگانے کا اہتمام کیوں نہیں کرتیں۔ درخت لگانا اللہ کی زمین کو سرسبز و شاداب بنا کر مالک ارض و سما کو خوش کرنے کے مترادف بھی ہے جس کے جواب میں قدرت ربانی وہاں بارشیں کثرت سے برساتی ہے۔ یورپ میں درختوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بغیر سرکاری اہل کار کے کوئی شخص درخت نہیں کاٹ سکتا۔ ہر درخت کا فائلوں میں اندراج ہے۔ یورپ درختوں سے سرسبز و شاداب اور خوبصورت ہے اور دنیا بھر کے سیاح وہاں آتے جاتے ہیں جو ملکی معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پچیس سے تیس سال پہلے میدان عرفات ریتلا میدان تھا۔ اکثر حجاج

وہاں موسمی حدت کی وجہ سے بیمار ہو جاتے تھے۔ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیا الحق مرحوم نے وہاں نیم کے پودے بڑی تعداد میں بھیجے اور اب یہ چٹیل میدان ہرا بھرا ہو گیا ہے حکومت سعودیہ ان نیم کے درختوں کی پوری پوری حفاظت کرتی ہے۔ اور ان کی دیکھ بھال کیلئے مستقل محکمہ تشکیل دیا ہوا ہے جو اپنا کام نہایت دیانتداری سے سرانجام دے رہا ہے (پاکستان کے محکمہ جنگلات کی طرح غیر ذمہ داری نہیں کرتا) ۔ سعودی محکمہ جنگلات وزراعت کی دیانتداری کی وجہ سے یہ علاقہ جسے قرآن نے وادی غیر ذی ذرع قرار دیا اب ہرا بھرا نظر آرہا ہے لیکن ہمارے ہاں لوگ شہری آبادیوں میں کوئی درخت نہیں رہنے دیتے اور جنگلات کے درخت کاٹ کاٹ کر بیچتے بھی ہیں اور زمین حاصل کرنے کیلئے بلاوجہ آگ بھی لگا دیتے ہیں۔ درخت لگانے کیلئے مناسب زمین ، موسم اور دوسری ضروریات کا علم ہونا چاہیئے۔ مشہور ماہر جنگلات پروفیسر محمد طاہر صدیقی کہتے ہیں کہ جنوبی پنجاب کی آب وہوا زیادہ تر خشک ہے اس لئے یہاں خشک آب وہوا کو برداشت کرنے والے درخت لگائے جانے چاہئیں۔ خشکی پسند اور خشک سالی برداشت کرنے والے درختوں میں بیری، شیریں، سوہانجنا، کیکر، پھلائی، کھجور، ون، جنڈ اور فراش کے درخت قابل ذکر ہیں۔ اسکے ساتھ آم کا درخت بھی جنوبی پنجاب کی آب وہوا کے لئے بہت موزوں ہے۔ وسطی پنجاب میں نہری علاقے زیادہ ہیں اس میں املتاس، شیشم، جامن، توت، سمبل، پیپل، بکاین، ارجن اور لسوڑا لگایا جانا چاہئے۔ شمالی پنجاب میں کچنار، پھلائی، کیلا، اخروٹ، بادام، دیودار، اوک کے درخت لگائے جائیں۔ کھیت میں کم سایہ دار درخت لگائیں ان کی جڑیں بڑی نہ ہوں اور وہ زیادہ پانی استعمال نہ کرتے ہوں۔ سفیدہ صرف وہاں لگائیں جہاں زمین خراب ہو یہ سیم و تھور ختم کر سکتا ہے سفیدہ ایک دن میں 25 لیٹر پانی پیتا ہے۔ لٰہذا جہاں زیر زمین پانی کم ہو اور فصلیں ہوں وہاں سفیدہ نہ لگائیں۔ اس کے بارے میں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ اسلام آباد، سطح مرتفع اور خطہ پوٹھوہار کے لئے موزوں درخت دلو، پاپولر، کچنار، بیری اور چنار ہیں۔ اسلام آباد میں لگا پیپر ملبری الرجی کا سبب ہے اس کو ختم کرنا چاہیے۔ خطے میں اس جگہ کے مقامی درخت لگائے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ زیتون کا درخت بھی یہاں لگایا جاسکتا ہے۔ سندھ کے ساحلی علاقوں میں پام ٹری اور کھجور لگانا چاہیے۔ کراچی میں املتاس، برنا، نیم، گلمہور، جامن، پیپل، بینیان، ناریل اور اشوکا لگایا جائے ۔ اندرون سندھ میں کیکر، بیری، پھلائی، ون، فراش، سہانجنا اور آسٹریلین کیکر لگانا چاہیے۔ کراچی میں ایک بڑے پیمانے پر کونو کارپس کے درخت لگائے گئے ہیں۔ یہ درخت کراچی کی

آب و ہوا سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ درخت شہر میں پولن الرجی کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ دوسرے درختوں کی افزائش پر بھی منفی اثر ڈالتے ہیں جبکہ پرندے بھی ان درختوں کو اپنی رہائش اور افزائش نسل کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ بلوچستان کے شہر زیارت میں صنوبر کے درخت لگائے جانے چاہئیں۔زیارت میں صنوبر کا قدیم جنگل بھی موجود ہے ۔ زیارت کے علاوہ دیگر بلوچستان خشک پہاڑی علاقہ ہے اس میں ون، کرک، پھلائی، کیکر، بوڑھ، چلغوزہ، پائن، اولیو اور ایکیکا لگایا جانا چاہئے۔ کے پی کے اور شمالی علاقہ جات میں شیشم، دیودار، پاپولر، کیکر، ملبری، چنار اور پائن ٹری لگایا جائے۔ درخت لگانے کے بہترین موسم ۔ پاکستان میں درخت لگانے کا بہترین وقت فروری مارچ اگست اور ستمبر کے مہینے ہیں، درخت لگانے اور ان کی حفاظت کا طریقہ اگر آپ سکول کالج یا پارک میں درخت لگا رہے ہیں تو درخت ایک قطار میں لگائیں اور ان کا فاصلہ دس سے پندرہ فٹ ہونا چاہیے۔ گھر میں درخت لگاتے وقت دیوار سے دور لگائیں۔ آپ بنا مالی کے بھی درخت لگا سکتے ہیں، نرسری سے پودا لائیں زمین میں ڈیڑھ فٹ گہرا گڑھا کھودیں۔ نرسری سے ہی گینگ ریت (مٹی سے بنی ہوئی) لائیں اور گڑھے میں ڈال دیں، پودا اگر کمزور ہے تو اس کے ساتھ ایک چھڑی باندھ دیں۔ پودا ہمیشہ صبح یا شام کے وقت لگائیں۔ دوپہر کے وقت نہ لگائیں، اس سے پودا سوکھ جاتا ہے۔ پودا لگانے کے بعد اس کو پانی دیں۔ گڑھا گہرا رکھیں تا کہ وہ پانی سے بھر جائے ۔ گرمیوں میں ایک دن چھوڑ کر جبکہ سردیوں میں ہفتے میں دو بار پانی دیا جائے۔ پودے کے گرد کوئی جڑی بوٹی نظر آئے تو اسک وکھرپے سے نکال دیں ۔ اگر پودا مرجھانے لگے تو گھر کی بنی ہوئی کھاد یا یوریا فاسفورس والی کھاد اس میں ڈالیں لیکن بہت زیادہ نہیں ڈالی جائے . زیادہ کھاد سے بھی پودا سڑ سکتا ہے ۔ بہت سے درخت جلد بڑے ہو جاتے ہیں کچھ کو بہت وقت لگتا ہے۔ سفیدہ پاپولر سنبل شیشم جلدی بڑے ہو جاتے ہیں جبکہ دیودار اور دیگر پہاڑی درخت دیر سے بڑے ہوتے ہیں ۔ گھروں میں کوشش کریں شہتوت، جامن، سہانجنا، املتاس، بکائن یا نیم لگائیں اور ضروری بات کہ پودا لگاتے وقت مخلوق خدا کی منفعت کی نیت رکھیں۔ اس پر اللہ تعالی اجر بھی دے گا اور درخت میں برکت بھی دے گا۔

پیارے بچو! دنیا میں کئی ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔ ان میں سے ایک شجر کاری بھی ہے۔ شجر کاری ہر دور کے انسان کے لیے اہم رہی ہے اور رہے گی۔ جب پہلے زمانے میں انسان کے پاس گھر نہ تھا تو اس نے درخت کو اپنا بسیرا بنایا۔ جب وہ بھوکا مرہو تا تھا تو درخت کے پھل ہی تھے جو اسے سہارا دیتے تھے۔ آج بھی انسان درخت سے بہت سے کام لے رہا ہے اور لیتا رہے گا۔ انسان لکڑیاں درخت سے ہی حاصل کرتا ہے گوند، شہد وغیرہ سب انسان نے درخت سے حاصل کیا۔ جس طرح انسان درخت سے کام لیتا ہے پرندے اور جانور بھی اس سے کام لیتے ہیں۔ تقریباسارے پرندے درخت پر گھونسلہ بناتے ہیں۔ سبزی خور پرندے اپنی غذا بھی درخت سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ غرض کہ درخت انسان کیلئے ہی نہیں پرندوں اور جانوروں کیلئے بھی مفید ہیں۔ آج دنیا کو ایک اور بڑا مسئلہ درپیش ہے اور وہ ہے گلوبل وارمنگ ۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اگر گلوبل وارمنگ کو روکا نہیں گیا تو یہ دنیا کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے اور اس کا حل ہے تو صرف اور صرف درخت۔ درخت سے گلوبل وارمنگ کو زیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر افسوس آج بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلی ہیں۔ آج بھی ہم درخت کو بے رحمی سے کاٹتے جارہے ہیں اور اس کے وجود کو ختم کرتے جارہے ہیں۔ ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ درخت لگائے جائیں۔ ان کی دیکھ بھال کی جائے اور آنے والی نسل کو بھی شجر کاری کے فوائد اور اہمیت سے واقف کرایا جائے۔۔

ماحولیاتی آلودگی (مضمون)

ماحول اور انسان ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفق ہیں۔ اللہ پاک نے انسان کے لیے اس ماحول کو متوازن پیدا کیا۔ انسان نے کرہ ارض پر آنکھ کھولی تو اس کی اولین شناسائی اسی ماحول سے ہوئی۔ یہی ماحول انسان کا پرورده اور نگہبان تھا مگر جوں جوں انسان ترقی کی منازل طے کرتا گیا اور جدیدیت سے پس جدیدیت تک کی منازل کو پاؤں تلے روندتا گیا وہ اپنے اولین اور دائمی پرورده کو بھی تباہی کے دھانے کی طرف دھکیلتا گیا۔ وہی ماحول جو کبھی انسان کا سائباں اور محافظ تھا آج انسان کی اپنی تباہی کا شاخسانہ بن چکا ہے۔ آج گلوبل وارمنگ' اوزون کی تباہی' آبی و فضائی آلودگی' شور کی آلودگی اور شدید موسمی تبدیلیاں نہ صرف انسان بلکہ اس کرہ ارض کی بقا کے لیے خطرہ بن چکی ہیں۔ Professional Educators Punjab

مادیت پرستی اور ماحولیاتی تباہ کاری

ماحولیاتی آلودگی کا تعلق انسان کے اخلاقی، ثقافتی، تعلیمی، معاشرتی اور معاشی زوال کے ساتھ براہ راست جڑا ہے۔ انسان کی مادیت پرستی نے اسے زندگی کے سبھی اخلاقی اصولوں سے مبرا کر دیا ہے۔
Professional Educators Punjab

انڈسٹریز کے قیام کے لیے بے جا درختوں کی کٹائی' فیکٹریز کا گندہ مواد دریا اور سمندر برد کرنا' پیداوار میں اضافے کے لیے کیمیکل سپرے' بڑھتی ہوئی آرام طلبی کے سبب بے بہا گاڑیوں کا استعمال اور بڑھتی انسانی ضروریات اور آرام طلبی کے پیش نظر فیکٹریز کی پروڈکشن میں اضافہ' ایسے عوامل ہیں جنھوں نے انسان کو اس کے ان اخلاقی اصولوں سے مبرا کر دیا ہے جو اس ماحول کے محافظ تھے۔ Professional Educators Punjab

اختتام

ماحولیاتی آلودگی کی سب سے بڑی وجہ صنعتکاری کا فروغ' جنگلات کا خاتمہ' شہروں کا بہت زیادہ بڑھنا' اسی طرح غذائی اجناس کی کمی پوری کرنے اور فصلوں کی پیداوار بڑھانے کیلئے کھادوں' کیڑے مار ادویات' فنجائی مار ادویات' جڑی بوٹیوں کو تلف کرنے والی ادویات اور سپرے کا استعمال ہے۔ آلودگی طبیعتوں میں چڑچڑاپن' سر درد' تھکاوٹ' ڈیپریشن اور بہرے پن کا موجب بن رہی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے

زبردست موسمیاتی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جو بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔ اگر انسان نے اپنے ماحول کو بچانا ہے تو اسے مادیت پرستی اور آرام طلب طرز زندگی ترک کر کے سادگی اور قناعت اختیار کرنا ہو گی ورنہ کرہ ارض کی تباہی شاید صدیوں ںہیں بلکہ سالوں کی بات بن جائے۔ Professional Educators Punjab

زندگی ہے گزارنا مشکل
دم نکلتا ہے سانس گھٹتا ہے
میں تو سگریٹ بھی اب نہیں پیتا
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

Nov 14, 2020

شیئر کریں:

Google+ Share Share

مجموعی طور پر زمین، فضا اور پانی کو ماحول کہتے ہیں جس میں تمام حیاتیاتی، طبیعاتی اور کیمیائی اجزاء و عناصر شامل ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے اسے ماحول کہا جاتا ہے۔عام طور پر ماحول کا اطلاق ہمارے ارد گرد موجود تمام اشیاء پر ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ وسیع مفہوم کا حامل ہے جس سے مراد پوری دنیا ہے۔ بعض مفکرین نے ماحولیاتی آلودگی کو ہوا کی آلودگی، پانی کی آلودگی، زمینی آلودگی، مٹی کی آلودگی تک محدود کر دیا ہے لیکن معاشرتی آلودگی، اخلاقی آلودگی، سیاسی آلودگی، تعلیمی آلودگی اور معاشی آلودگی کو ماحولیاتی آلودگی میں شامل نہیں کیا۔ اگر بنظرِ غائر ماحول اور ماحولیات کا جائزہ لیا جائے تو یہ آلودگی محض ہوا، پانی اور مٹی تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس میں وہ تمام اقسام کی آلودگی شامل ہوتی ہے جو

ہمارے ارد گرد پائی جاتی ہیں۔ اگر چہ یہ بات یقینی ہے کہ ہوا، پانی اور مٹی کی آلودگی انسانی صحت کو شدید متاثر کرتی ہے لیکن اس بات سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی آلودگی انسانی کردار کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان ماحول کی خرابی سے دو طرح سے متاثر ہوتا ہے ایک ذہنی اور اخلاقی طور پر اور دوسرا جسمانی طور پر۔ مختلف آلودگیوں کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں، لیکن عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صنعتی انقلاب نے زمینی اور فضائی آلودگی کو شدید متاثر کیا ہے۔ تیزی سے بڑھتا ہوا صنعتی عمل، بڑی مقدار میں فاسد مادوں کی پیداکاری، جنگلات کی کٹائی، پینے اور آبپاشی کے غیر معیاری پانی کی وجہ سے پاکستان کو نہایت گھمبیر ماحولیاتی مسائل کا سامنا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے سبب نئے نئے کارخانے اور صنعتی ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ ان صنعتی اداروں میں استعمال ہونے والے ایندھن کی وجہ سے ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس طرح ان فاضل مادوں کے اخراج کی وجہ سے طبعی ماحول متاثر ہو رہا ہے۔ اسی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے بعد کیمیاوی ادویات ایجاد ہوئیں جس سے زیادہ پیداوار کا حصول تو ممکن ہو گیا لیکن ان ادویات کے استعمال کی وجہ سے زمین میں مضر اثرات بھی پیدا ہوئے۔ اسی وجہ سے بعض نباتات آلودہ زمین سے کیمیاوی اجزاء کے ذریعے اپنے اندر زہریلے اثرات رکھتے ہیں۔ نتیجتاً ان زہریلی ادویات کا اثر انسانی جسم پر نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ زراعت کے استعمال میں ہونی والی کیڑے مار دوائیاں زمینی پانی کو آلودہ کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ ان کے علاوہ تجارتی مراکز کا دھواں، گاڑیوں کا دھواں اور سیوریج کا گندا پانی فضائی اور آبی آلودگی کا باعث ہیں جن کی وجہ سے کاشت کاری اور فصلیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ جب

ان فصلوں سے حاصل کی جانے والی غذا انسانی جسم میں داخل ہوتی ہے تو یہ دھاتی اجزاء معدے، جگر اور گردوں کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ انسانی صحت کے لیے کھلی فضا اور صاف ہوا میں سانس لینا بہت ضروری ہے لیکن اس ترقی یافتہ اور سائنٹیفک دور میں انسان کو نہ صاف ہوا میسر ہے اور نہ ہی کھلی فضا۔ اس جدید ترین دور میں انسان آلودہ زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس آلودہ زندگی سے انسان نہ صرف بے شمار برائیوں کا شکار ہو رہا ہے بلکہ ایک فعال زندگی گزارنے کے بجائے ذہنی کوفت میں مبتلا ہو رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی ماحولیاتی آلودگی کی سب سے بڑی وجہ فضائی آلودگی ہے جو ایک صحت مند معاشرہ تشکیل دینے میں

بڑی رکاوٹ بن رہی ہے۔ ہر قسم کی آلودگی کے خاتمے کے لیے قومی سطح پر انسانی رویوں میں تبدیلی ضروری ہوتی ہے۔ فضائی آلودگی پر قابو پانے کے لیے اسلام میں درخت لگانے اور ان کی حفاظت پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ یہ سبزہ ہی ہے جس سے فضائی آلودگی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ درخت لگانا ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اس کارِ خیر کا ردس دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سیرتِ النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے بنفسِ نفیس درخت بھی لگائے اور درخت لگانے کی ترغیب بھی دی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے زمین کو غیر آباد چھوڑنے کے بجائے اس کو کاشتکاری اور زراعت کے ذریعے ہری بھری رکھنے کی ترغیب ارشاد فرمائی۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مسلمان شجر کاری یا کاشتکاری کرتا ہے پھر اس میں سے کوئی پرندہ، انسان یا حیوان کھاتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ (بخاری: 2320) درخت لگانے کی فضیلت پر ایک روایت میں حضور نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص کوئی درخت لگاتا ہے تو جتنا اس کے ساتھ پھل لگتا ہے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ اس کے لیے اجر لکھتا ہے۔ (کنز العمال: 9057) حضور نبی اکرم ﷺ نے جس طرح پیڑ اور پودے لگانے کی ترغیب فرمائی ہے اسی طرح بلاوجہ پیڑ کاٹنے اور پودے اکھاڑنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے بلاوجہ پیڑ کاٹنے والوں کے لیے وعید فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی پیڑ کو (بلاضرورت) کاٹے گا، اللہ تعالیٰ اس کا سر جہنم میں ڈالے گا۔ (ابوداؤد: 5239) آلودگی کی ایک اور اہم قسم زمینی آلودگی ہے۔ زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے فصلوں پر کیڑے مار ادویات کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے پیداوار میں تو اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن ان ادویات کے استعمال سے مٹی کے اوپر کی تہہ کی زرخیزی خاصی کم ہو جاتی ہے۔ پوری دنیا بالخصوص پاکستان میں دیگر آلودگیوں کے ساتھ زمینی آلودگی بھی ایک بہت سنگین مسئلہ ہے۔ زمینی آلودگی کی وجوہات میں سے بڑی وجہ اردگرد کے ماحول کو پاک وصاف نہ رکھنا ہے۔ بالفاظ دیگر جگہ جگہ گندگی پھیلانا اور کوڑا کرکٹ ڈالنا زمینی آلودگی کو جنم دیتا ہے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے ماحولیاتی آلودگی کو پاک کرنے کے لیے جو اصول بتائے ہیں ان میں گلیوں، محلوں اور راستوں کی صفائی بھی شامل ہے۔ آپ ﷺ نے متعدد احادیث مبارکہ میں گندگی پھیلانے سے منع فرمایا

ہے اور گندگی پھیلانے والوں کی مذمت فرمائی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے کہ گلیوں، راستوں، شاہراہوں اور میدانوں میں گندگی اور غلاظت کی چیزیں نہ ڈالی جائیں کیونکہ غلیظ، بدبودار اور مردار چیزیں ڈالنے سے اردگرد کا ماحول آلودہ ہوتا ہے جس سے پورا محلہ اور علاقہ متاثر ہوتا ہے۔لہٰذا وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے ساتھ ساتھ بالخصوص عوام پر بھی اپنی استطاعت کے مطابق اپنے اردگرد کے ماحول کو ہر طرح کی آلودگی سے پاک رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔اسی طرح ہم پر یہ ایک اخلاقی فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ شاہراہوں پر موجود اذیت ناک چیزیں ہٹائی جائیں تاکہ ماحول خوشگوار رہ سکے۔پانی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔اس گمبھیر مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ پانی کے گھٹتے ذخائر نیز پانی کی آلودگی۔ اس آلودگی کے لیے کئی عوامل ذمے دار ہیں ۔ہماری صنعتیں، بطور خاص رنگ، کیمیات، کھاد، جراثیم کش ادویات ایک طرف تو گہرا گھنا دھواں چھوڑ کر ہوا کو آلودہ کرتے ہیں دوسری جانب ایسے صنعتی فاضل مادے خارج کرتے ہیں جو تالابوں، ندیوں حتیٰ کہ سمندروں کو آلودہ کرتے رہتے ہیں ۔(ماحولیات اور انسان، ص 15)عمومی طور پر پوری دنیا میں بالخصوص پاکستان میں آبی آلودگی بھی انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ آبی آلودگی کو صحت کا سب سے بڑا خطرہ سمجھا جاتا ہے۔عدم توجہی کے پیشِ نظر یہ مسئلہ انتہائی سنگین صورتحال اختیار کرتا جارہاہے۔ صنعتی علاقوں کا کثیف مادہ عموماً صاف کیئے بغیر ہی ندی نالوں اور دریائوں میں بہادیا جاتا ہے۔اس سے نہ صرف آبی حیات متاثر ہوتے ہیں بلکہ ایسے پانی کو آبپاشی کے لیے استعمال کرنے سے کئی مضر کیمیائی اجزاء پودوں کی جڑوں میں سرایت کرجاتے ہیں۔ ایسے پودوں کو بطورِ خوراک استعمال کرنے سے انسانی صحت کو شدید خطرات لاحق ہوجاتے ہیں۔(ماحولیاتی آلودگی۔احکام و مسائل، ص 8)انسانی زندگی کی بقاء کے لیے صاف پانی کی فراہمی انتہائی ضروری ہے۔ماہرین کے مطابق دنیا بھر میں ہر سال 3.4 ملین افراد گندے پانی کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں سے ہلاک ہوجاتے ہیں۔ ان بیماریوں میں ٹائیفائیڈ، ہیپاٹائٹس، ڈائریا اور ہیضہ شامل ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ انسانی فضلے کی پینے کے پانی میں ملاوٹ ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کے لیے نہ صرف سیوریج کے نظام کو بہتر کرنا ضروری ہے بلکہ پینے کے پانی کو بھی ٹریٹ (صفائی) کرنے کی ضرورت ہے۔اقوام متحدہ کے ادارہ برائے ماحولیات یو این ای پی کی سائنسدان

جیکولین میک گلیڈ کا کہنا ہے کہ صاف پانی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور یہ انسانی صحت اور انسانی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن اگر ہم آبی آلودگی کو نہ روک سکے تو ہم صاف پانی کے حصول میں ناکام ہو جائیں گے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا کہ فیکٹریوں کا فضلہ اور ضائع شدہ فصلوں کی دریاؤں میں تلفی پانی کی آلودگی میں اضافہ کر رہی ہے۔ یاد رہے کہ بعض ممالک کی 90 فیصد آبادی پینے کے پانی کے لیے دریاؤں اور جھیلوں پر انحصار کرتی ہے۔ سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے معاشرے کو ہر قسم کی آلودگی سے بچانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر سر انجام دینے والی کاوشوں کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور اس خطرناک مسئلے سے بچنے کے لیے رہنما اصولوں کی نشاندہی کی ہے۔ آپ ﷺ نے زمینی آلودگی کے سدباب کے لیے کھیتی باڑی اور شجر کاری کی ترغیب دی ہے۔ آبی آلودگی سے بچنے کے لیے پانی کو صاف رکھنے اور اس میں گندگی نہ ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ ہوائی آلودگی کے روک تھام کے لیے ہوا کو بدبو اور گندگی سے پاک کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کی روک تھام کے لیے یہ نبی کریم ﷺ کی ایک بھرپور کوشش اور موثر حکمتِ عملی تھی جو آج کے دور میں بھی ہمارے لیے رہنمائی کا بہترین ذریعہ ہے اور آج کے جدید دور میں بھی ان ہدایات پر عمل کیے بغیر ماحولیاتی آلودگی کی روک تھام مشکل ہے۔ آکودگی سے پاک معاشرہ ہی جدوجہد حیات اور ترقی کی رفتار میں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ ماحول، انسانوں اور قوموں کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جہاں ماحول انسان سے متاثر ہوتا ہے، وہاں انسان بھی اپنے ماحول سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسان اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے تو ماحول انسان ہی کا دوسرا روپ ہے، گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ (ماحولیاتی آلودگی۔ احکام و مسائل، ص 9) وقت کا تقاضا ہے کہ ہم آج ہی سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ ماحولیاتی آلودگی کو ختم کرنے کے لیے سب سے مفید اور کارآمد اقدام پورے ملک میں شجر کاری کرنا ہے۔ شجر کاری کے پروگرام کو کامیاب بنانا محض وفاقی حکومت، صوبائی حکومت یا کسی ایک محکمہ کے بس کی بات نہیں ہے، اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہر شہری کو اپنا حصہ ملانا ضروری ہے۔ اسی طرح شہروں، محلوں، سڑکوں اور گلیوں کو آلودگی سے پاک رکھنا پوری قوم کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کے باعث آلودگی میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا ماحولیاتی آلودگی کی روک تھام میں جب تک پوری قوم اجتماعی طور پر شامل نہیں ہوگی تو کامیابی کا حصول ممکن نہ ہو سکے گا۔

ماحولیاتی آلودگی

عارف عزیز(بھوپال)

آج جس برق رفتاری سے دنیا بدل رہی ہے اسی تیزی سے انسانی ذہن ومزاج بھی تبدیل ہورہا ہے یہی انسانی ذہن کہیں رات کو دن اور گرمی کو سردی سے بدلنے میں مصروف ہے تو کہیں پرندوں سے تیز اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ جانے میں اپنی عقل کا استعمال کررہا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کو یہ عقل مخلوق کی فلاح وبہبود کیلئے عطا کی تھی مگر اندازہ یہ ہورہا ہے کہ یہی شعور اس کے لئے مسائل بلکہ تباہی کا سبب بن گیا ہے کیونکہ صنعت کاری، شہروں کی غیر معمولی آبادی اور دیگر ترقیات کے باعث ماحول کی خرابی نے اس کی زندگی میں سنگین عدم توازن پیدا کردیا ہے۔ ہمارا ملک بھی انہی مسائل سے دوچار دینا کا ایک حصہ ہے جہاں جنگلات کاٹے جارہے ہیں زرخیز مٹی برباد ہورہی ہے، صنعتی فضلات کے باعث پینے کا صاف پانی اور فضا مسموم ہورہی ہے جبکہ ماحول کی یہ کثافت کسی زہریلی شے سے کم نہیں ہے کیونکہ کارخانوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں، ہوائی جہاز سے چھوڑی جانے والی گیس، سواریوں کے ایندھن جلنے سے پیدا ہونے والی سمیت میں کاربن، نواکسائڈ، سلفر ڈائی اکسائڈ، نائٹروجن اکسائڈ اور سیسہ پایا جاتا ہے جس سے انسان طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہورہا ہے اسی طرح صنعتی اور شہری کثافت سے آلودہ پانی بھی انسانی زندگی کیلئے انتہائی خطرناک ہے مگر ملک کی ۷۰ فیصد آبادی جو دیہات میں رہتی ہے اور جہاں صاف پانی کی فراہمی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے اس کی بڑی تعداد عموماً آلودہ پانی استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ یہی حال کارخانوں، سڑکوں، بازاروں اور سواریوں کے ذریعہ پیدا ہونے والے شور کا بھی ہے جو انسانی اعصاب کو تیزی سے متاثر کررہا ہے۔ انسانی صحت کیلئے مذکورہ اشیاء ہی خطرناک نہیں بلکہ بے تحاشہ استعمال میں آنے والی کیمیائی اشیاء، دوائیں، کیڑے مار ادویہ، پلاسٹک پیکنگ اور آرائشی سامان وغیرہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن سے آلودگی پیدا ہورہی ہے اور صحت پر منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں جو ایک دن کینسر جیسے موذی مرض کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔

انسانی جسم کا نظام کچھ اس طرح کا ہے کہ اگر اس میں زہر بھی داخل ہو جائے تو ایک خاص مقدار تک وہ اس کا دفاع کر سکتا ہے چنانچہ کیمیاوی آلودگی، فضائی کثافت، پانی کی سمیت اور شور کا بھی وہ مقابلہ کرتا رہتا ہے لیکن ان سب کا حد سے تجاوز ایک دن اس کے لئے ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ مذکورہ آلودگیوں کے خلاف ضروری اقدامات عمل میں لائے جائیں اور قانون و قواعد مرتب کرتے وقت ملک کے عام حالات اور یہاں کے عام ذہن کا لحاظ رکھا جائے ویسے قانون سازی سے ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانا آسان نہیں اس کے لئے تو عوام کی تربیت ضروری ہے۔ جو حفظان صحت کے امور سے متعلق ان میں شعور پیدا کر دے اور یہ آگاہی بھی کہ اگر انہوں نے اپنے ماحول کو صاف و شفاف نہ رکھا تو ایک دن وہ ان کی ہلاکت کا باعث بن جائے گا۔

ماحولیاتی مسائل، اور ان کا سدِباب

انسان صدیوں سے اس زمین پہ زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ انسان اور زمین لازم وملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ممکن نہیں۔

ماحولیات میں آلودگی سے پہلے پاکستان بہت ہی خوبصورت تھا اور اس وقت ہر شے خوبصورت لگتی تھی۔ شہر، قصبے، گاؤں، ندی نالے، چشمے، نہریں، ندیاں، دریا، پہاڑ، سڑکیں، کچے پکے راستے اور کھیت سب کچھ حسین تھا۔ صاف ستھرا ماحول، موسم اپنے وقت پر بدلتے، کسان وقت پر بوتے، وقت پر کاٹتے۔ سب کچھ فطرت کے اصولوں کے مطابق چلتا تھا۔ اس لیے خدا اور بندے دونوں ہی خوش رہتے تھے۔ لکین اب پہلے جیسا ماحول نہیں رہا جیسا کہ پہلے کے وقت میں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب سب سے زیادہ آلودگی پاکستان میں ہی پیدا ہوگئی ہے اور کی وجہ انسان ہیں۔

انسان نے اپنی کارستانیوں کی وجہ سے ماحول کو آلودہ کیا ہے۔ اس کی وجہ سے اب پاکستان کی فضائیں زہریلی ہو چکی ہیں۔ صاف شفاف ہوا آلودہ ہو چکی ہے۔ ندیاں چشمے اور دریا بدبودار ہو چکے ہیں۔ زہریلی گیسوں اور گاڑیوں کے دھوئیں نے آسمان کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ خوفناک بیماریاں تیز رفتاری سے پھیل رہی ہیں۔ اور زیادہ تر انسان اس کی گرفت میں مبتلا ہیں۔ پہلے ماحول اتنا آلودہ نہ تھا جتنا آج کے دور میں ہو گیا ہے۔ اب تو ہر طرف آلودگی ہی نظر آتی ہے۔ اور آنے والے وقت میں اس پر روک نہ لگائی گئی تو اس کا منظر اور بھی خوفناک ثابت ہو گا۔ فضا کی آلودگی ایک عالمی مسئلہ بھی ہے۔ لیکن ہم عالمی حالات نہیں بدل سکتے ہیں۔ بہتر یہی رہے گا کہ ہم اپنے گھر پر ہی توجہ دیں اور ایسے انتظامات کریں جن سے اس پریشانی کو دور کیا جا سکے۔

آج کل گاؤں، قصبوں اور شہروں میں گاڑیوں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی ہے کہ لوگوں کا چلنا محال ہو چکا ہے۔ اس اضافے سے ڈیزل، پٹرول اور گیس کے زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے فضا اس قدر آلودہ کر دی ہے کہ اب ماسک پہننا ضروری قرار دیا جا چکا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ سڑکوں اور راستوں پر پبلک ٹرانسپورٹ لائی جائے۔ جن سے دھواں نہیں نکلتا ہو اور وہ ماحول کو بھی آلودہ نہ کر سکیں۔

ذرائع نقل وحمل

اندرونی شہروں کے سفر کے لیے ڈبل ڈیکر بسوں کا استعمال کیا جانا چاہیے کہ گاڑیوں کی تعداد میں کچھ کمی ہو سکے۔ اور سڑکوں پر رش بھی کم ہو جائے گا۔ اسکولوں اور کالجوں، یونیورسٹیوں کو بسیں مہیا کی جائیں تا کہ طالب علم گاڑیوں، موٹر سائیکلوں کی بجائے بسوں میں سفر کریں۔

موٹر سائیکل کی تعداد کم کی جائے اور کیونکہ موٹر سائیکل کے چلانے سے ہی فضا سب سے زیادہ آلودہ ہوتی ہے اسلیے سائیکل کو رواج دیا جائے۔ سائیکل سواروں کے لیے سڑکوں پر ٹریک بنائے جائیں۔ کم قیمت لیکن عمدہ سائیکلیں لوگوں میں تقسیم کی جائیں۔ اور ایسی سائیکلیں بھی جو پہاڑی علاقوں میں بھی چلائی جا سکیں۔

ملکی سائنسدانوں کو اس مسئلے کے حل کے لیے ترغیب دی جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات دیے جائیں۔ تا کہ وہ ایسے سامان ایجاد کریں جو آلودگی روکنے میں معاون ثابت ہوں۔

ریل

دور کے سفر کے لیے ریل کے سفر کو عام کیا جائے اور اسے جدید اور آرام دہ بنایا جائے۔ دنیا بھر میں اس سفر کو انتہائی محفوظ سمجھا جاتا ہے اور یہ آلودگی کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ افسوس کہ ہم نے اس محفوظ سواری کو عام کرنے کے لیے بہت لاپرواہی برتی۔ موجودہ حکومت نے اس طرف کسی حد تک توجہ دی، لیکن اب بھی مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

عام آگاہی

آلودگی کو کم کرنے کے لیے نچلی سطح تک لوگوں میں آگاہی مہم شروع کی جائے۔ تا کہ لوگ اس مسئلے کو سمجھ سکیں۔ اور آلودگی کو کم کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

درخت لگانا یا شجر کاری کرنا

افسوس کہ اس ملک میں شجر کاری ہر سال کی جاتی ہے لیکن ابھی تک اس کے فوائد نظر نہیں آئے۔ درخت قدرت کی سب سے خوبصورت نعمت میں سے ایک ہیں، اور یہ آلودگی کو ختم کرنے کا سب سے کارآمد نتیجہ ہیں۔ اس سے ہمیں آکسیجن فراہم ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو درخت لگانے کے فوائد سے آگاہ کیا جائے اور درختوں کو کاٹنا ایک قومی جرم قرار دیا جائے۔ اس پر سختی سے عمل کیا جائے تا کہ ہم اس آلودہ ماحول کو کچھ حد تک کم کر سکیں۔ ہمارا مذہب بھی درختوں کے قتل عام سے منع

کرتا ہے۔ درختوں کی کٹائی روکنے کے لیے علماء بھی اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ شجر کاری بے شک کم کی جائے لیکن جتنی کی جائے وہ نظر آئے۔

فیکٹریاں اور کارخانے

فیکٹریوں اور کارخانوں کے زہریلے دھویں سے ندیاں، نہریں، تالاب، دریا آلودہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے پینے کے پانی کی کمی ہو رہی ہے۔ اور جو فیکٹریاں اور کارخانے زہریلے مواد کا علاج (Treatment) نہیں کرتے ان پر نہ صرف جرمانے کیے جائیں بلکہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو ان کارخانوں اور فیکٹریوں کو بند کر دیا جائے۔

محکمہ ماحولیات

افسوس ہے کہ ماحولیات کا محکمہ تو ہمارے ملک میں موجود ہے۔ لیکن اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو سال کے اندر اندر اس کے اثرات کم ہوتے نظر آنے لگیں گے اور ہمارا آلودہ پانی اپنی اصل حالت کی طرف لوٹنے لگے گا۔ ان قلیل المدت منصوبوں پر اگر آج سے ہنگامی بنیادوں پر عمل شروع کیا جائے تو امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ برس فضائی آلودگی میں کافی حد تک کمی ہو جائے گی۔ طویل المدت منصوبوں میں فیکٹریوں، کارخانوں، اور ندی نالوں کی وجہ سے بند کر کے گاؤں گاؤں جائزہ لے کر ان کا حل تلاش کرنا آسان ہو جا؟ گا۔ فیکٹریوں سے نکلنے والا زہریلا دھواں روکنے کے لیے سائنسی ذرائع اختیار کرنے پڑینگے۔

اس کے علاوہ کارخانوں اور اسپتالوں اور شہروں کا کچرا ٹھکانے لگانے کے لیے مستقل حل تلاش کرنے پڑیں گے۔ ملکِ عزیز سے آلودگی کو جلد از جلد مٹانا انتہائی ضروری ہے اور اگر ہم آلودگی کو نہ مٹا سکے تو آلودگی ہمیں مٹا دے گی۔

بچپن پر ایک مضمون

بچپن ہر انسان کے لئے زندگی کا ایک بہترین وقت ہوتا ہے۔ اس کے نام سے ہی اس کا مطلب سمجھ آجاتا ہے۔ بچپن بے گناہی کا زمانہ ہوتا ہے، میٹھی میٹھی شرارتوں سے بھرا ہوتا ہے اور زندگی کی سب سے بہترین خوشیوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ہم بچپن کی تعریف شروع کر دیں تو لفظ بچپن بہت چھوٹا پڑ جائے گا۔ ہاں اس بات کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ بچپن ہی انسان کی زندگی کا سب سے خوشگوار وقت ہوتا ہے میرے مطابق بچپن زندگی کا بہت اہم حصہ ہوتا ہے۔ جب ہمیں مستقبل کے مقاصد کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہوتی ہے۔ جیسے کل مجھے کیا کرنا پڑے گا؟ اگر میں کل صبح سویرے نہیں اٹھوں گا تو کیا ہوگا؟ بچپن ہی وہ وقت ہوتا ہے جب ہم معاشرتی مسائل سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس طرح کی دیگر بہت سی ذمہ داریوں سے اور تمام دنیا کی حقیقی رکاوٹوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ زندگی کے اس دور میں ہمیں اس بارے میں کوئی فکر نہیں ہوتی ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ جیسے کہ ہم آج بہت سی چیزوں کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں۔ بچپن میں ہم ہمیشہ لاپرواہ کی طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ ہمیں تو پریشان بھی نہیں کیا جاتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔</p>

<p>بچپن کو دیکھنے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہم نے اپنے کنبہ داروں، دوستوں، بھائی، بہنوں کے ساتھ وقت کس طرح گزارا۔ تہواروں کے دوران ہر بچے کا جو مزہ ہوتا تھا وہ اس لئے کہ اپنے کنبے کے ساتھ ٹور پر جاتے تھے اور پھر تہواروں کے دوران طرح طرح کی مختلف قسم کی مٹھائیاں اور پکوان کھاتے تھے۔ جب بھی ہم پرانے دنوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہ سب یادیں ہمیشہ ہمیں زندہ دل بناتی ہیں۔ یہ واقعتاً بچپن ہی ہے جس کے ذریعہ آپ ہمیشہ اپنے آپ کو کنبہ کے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے خوشگوار یادوں کو حاصل کر سکتے ہیں اس کے برعکس، کچھ چھوٹے غریب بچوں کے لئے ان کا بچپن اتنا خوشگوار نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن میں زیادہ سخت وقت گزارا ہو۔ کیونکہ ان کی قسمت کی وجہ سے وہ غریب گھر میں پیدا ہوئے ہیں جسکی وجہ سے انہیں وہ ساری سہولتیں نہیں مل پاتیں جو عام بچوں کو ملتی ہے۔ اُن بچوں کی پیدائش میں بھی انکے والدین کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انکی پیدائش کے بعد بھی وہ اپنا بچپن صحیح سے نہیں بسر کر پاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی بچپن کی وہ یادیں بھی انکے لیے بہت انمول ہوتی ہیں کیونکہ بچپن ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص اُسے نہ تو بھول پاتا ہے اور نہ ہی

بھولنا چاہتا ہے۔ میں ہمیشہ مانتا ہوں کہ یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زندگی کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بچپن کے دوران کوئی بھی ان سمت میں سوچنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔</p>

<p> یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ بچپن انسان کی آئندہ زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور بچپن کی یادیں یا تو خوشیوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں یا غموں سے لیکن میں ہمیشہ یہی دعا کرونگی کہ بچپن کی یادیں ہر بچے کے لئے ہمیشہ خوش کن رہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر بچہ زمین پر خدا کی رحمت ہوتا ہے لہذا اسے جتنا ہو سکے پیار اور محبت اور شفقت کے ساتھ پالنا چاہئے۔ بچپن زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اور ہر ایک کو یہ یاد رکھنا چاہیے۔ اسلیے ہمیں اپنے بچوں کا بچپن ایسا خوشگوار بنانا چاہیے کہ بڑے ہو کر وہ اُن حسین یادوں کو جب بھی یاد کریں تو کبھی انہیں اُن یادوں کی وجہ سے افسوس یا دکھ نہ ہو

بچپن اے بچپن

بچپن اے بچپن

بچپن اے بچپن

شیئر ٹویٹ

عابد محمود عزام پیر 9 دسمبر 2013

مزید شیئر

مزید اردو خبریں

بچپن کا زمانہ بڑی نایاب اور انمول شے ہے۔ یہ دور انسان کی وہ قیمتی متاع ہے، جس کے کھو جانے کا غم انسان کو ہمیشہ ستاتا ہے۔ انسان کتنے ہی بلند مقام و مرتبے یا کسی بھی عمر کو پہنچ جائے، لیکن ضرور کبھی کبھار مٹی میں کھیلتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچپن کی شرارتوں سے مزین معصوم و سہانی یادیں اس کی آنکھوں سے

آنسو بن کر بہہ پڑتی ہیں اور انسان ایسی وادیوں میں گم ہو جاتا ہے، جن سے واپس لوٹنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ انگریزی کے مشہور شاعر "جان ملٹن" نے تو بچپن کو "جنّتِ گمشدہ" یعنی کھوئی ہوئی جنّت کہا ہے۔

بچپن کی حسین یادیں تا عمر انسان کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں جگمگاتی رہتی ہیں۔ "بچپن" کہنے کو تو صرف چار حروف ہیں، لیکن ان حروف میں خدا جانے کیا کچھ چھپا ہے۔ معصومیت، نادانیاں، اٹھکیلیاں، حماقتیں، بے وجہ ضد اور بے شمار دلچسپ، دلکش اور دلربا یادیں۔ اسکول ہوم ورک نہ کرنے پر امی ابو کی شفقت بھری ڈانٹ ڈپٹ، مار پڑنے پر والدین سے ناراض ہو جانا اور پھر ان کا پیار سے منانا، اپنی مرضی کی کوئی چیز فوری لانے کی ضد کرنا، چیز نہ آنے پر اسکول نہ جانے کی دھمکی دینا، اپنی کوئی نئی چیز آنے پر تفاخرانہ انداز میں سب کو دکھانا، بہن بھائیوں کا آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑنا اور پھر کچھ ہی دیر میں صلح کر کے اکٹھے کھیلنے لگ جانا، گرمیوں کی چھٹیوں میں ننھیال جانے کے لیے خوشی خوشی تیاری کرنا، نانا ابو کی انگلی پکڑ کر باہر گھومنے جانا، نانی اماں کا دیر دیر تک کہانیاں سنانا، سارا دن کھیلتے رہنا، گھنٹوں گھنٹوں تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرنا، ریت کے گھروندے بنا کر خود ہی انھیں ختم کر دینا، کاغذ کے جہاز بنا کر اڑانا اور کاغذ کی کشتیاں بنا کر بارش کے پانی میں چلانا، بارش کے بعد چھت پر چڑھ کر چڑیوں کو دانا ڈال کر پکڑنے کی کوشش کرنا اور اسی قسم کی بے شمار یادیں انسان کی زندگی کا جزلاینفک ہے، جسے بھلانا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون
وہ کاغذ کی کشتی، وہ بارش کا پانی

بچپن میں ذرا ذرا سی بات پر دوستوں سے کٹّی کر بیٹھتے، لیکن کچھ ہی دیر بعد کسی بہانے دوبارہ ایک ساتھ کھیلنے لگتے اور پھر انھی دوستوں سے جن کے ساتھ کچھ دیر پہلے لڑائی ہوئی تھی، کھیل میں اس قدر مگن ہو جاتے کہ کھانا پینا اور اپنے گھر جانا بھی بھول جاتے تھے۔ گھر سے ملنے والے جیب خرچ سے اگر کھانے کی کوئی چیز

خریدتے تو ہرگز بخل سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ اس چیز میں سے کچھ ہی خود کھاتے اور باقی اپنے دوست کو دے دیتے تھے۔

بچپن میں جیبیں تو پیسوں سے خالی ہوتی ہیں، لیکن دل دولت محبت سے لبالب بھرے ہوتے ہیں۔ نہ کسی کو دولت کے انبار لگانے کی حرص ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی اپنے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے دوسروں کا مستقبل تاریک کرتا ہے اور اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کو نقصان بھی نہیں پہنچاتا۔ بچپن دشمنی، کینہ، بغض، حسد، تکبر، لالچ اور ان تمام برائیوں سے دور ہوتا ہے، جو انسان سے خوشیاں چھین لیتی ہیں۔ بچپن ایسی ہی معصوم یادوں سے عبارت ہے۔ اسی لیے تو بچوں کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ ہر قسم کے دکھلاوے، خود پسندی اور خود نمائی سے بالکل پاک زندگی، نہ جاہ و جلال کا شوق اور نہ شہرت کی طلب۔ نہ دنیا کی تنقید کی فکر اور نہ اپنی رسوائی کا خوف۔ والدین سے جو مطالبہ کیا، رو رو کر پورا کروالیا، لیکن بڑا ہو کر تو انسان رسوائی کے خوف سے ایک آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔ بہ قول شاعر

اب تو اک آنسو بھی رُسوا کر دیتا ہے
بچپن میں جی بھر کے رویا کرتے تھے

ہمارا بچپن دیہات میں گزرا۔ چھپن چھپائی، اونچ نیچ کا پہاڑ، پٹھو گرم، بارہ ٹینی، چاری کھڈا، بنٹے، بندر کلا اور کرکٹ کھیلتے بچپن خواب کی مانند گزر گیا۔ جب اسکول جانا شروع ہوئے تو لکڑی کی تختی، لوہے کی سلیٹ، سیاہی کی دوات، سیاہ اور سفید سلیٹیاں، تختی کو لگانے کے لیے پچی مٹی (گاچی)، سرکنڈوں سے بنے ہوئے کچھ قلم اور کچھ کتابیں، یہ سب کچھ گھر میں سلے ہوئے کپڑے کے ایک بستے کا مخزن ہوتا تھا۔ تختی پر سیاہی کے ساتھ قلم سے لکھ کر استاد کو دکھاتے اور پھر تختی کو دھو کر اس کے اوپر گاچی لگا کر دھوپ میں خشک کرتے کرتے کافی وقت گزر جاتا تھا۔

اس وقت شاید دنیا کا سب سے مشکل کام روز صبح سویرے اسکول جانا لگتا تھا اور اسکول سے چھٹی کے دن تو عید کی سی خوشی ہوتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ماسٹر صاحبان لکھنے کے لیے اتنا زیادہ کام دیتے تھے کہ کتاب کو دیکھتے ہی بوریت محسوس ہونے لگتی تھی۔ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر اسکول کا کام کرنے کی غرض سے چارپائی لے کر کھیتوں میں جاتے، لیکن وہاں جا کر کتاب کھول کر بھی نہ دیکھتے اور کھیتوں میں

اپنے مالٹے کے باغ، آم، جامن اور امرود کے درختوں کی پر سکون چھاؤں میں بیٹھے کھیلتے کھیلتے سارا دن گزار دیتے۔

جب گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو قریب ہوتیں، یہ سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے کہ اسکول کا کام نہ کرنے پر ماسٹر صاحبان بہت پٹائی کریں گے۔ آخری بیس پچیس چھٹیوں میں دن رات ایک کر کے اپنا کام مکمل کرتے۔ کچھ بڑے ہوئے تو کرکٹ کی ایسی لت پڑی کہ اسکول سے آنے کے بعد جتنا وقت بھی فارغ ملتا، وہ گیند بلے کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ پنجاب میں جون جولائی کے مہینے میں بے تحاشہ گرمی پڑنے کے باوجود صبح سے شام تک کرکٹ کھیلنے میں ہی محو رہتے۔

اندازہ کریں کہ بچپن پر سکون دیہات میں گزارنے والا شخص، پاکستان کے خطرناک ترین شہر کراچی جہاں خوف و ہراس کا بسیرا ہو، میں ڈیرے ڈال کر صحافت سے منسلک ہو جائے اور اسے عالم اسلام اور پاکستان میں بد امنی، بے سکونی، غربت، ناخواندگی، دھوکا دہی، مسلکی و سیاسی قتل و غارتگری، ہر شعبہ میں بے انتہا کرپشن، ملکی سالمیت و خود مختاری کی پامالی اور اسی قسم کی بے شمار دل و روح کو چھید کر چھلنی کر دینے والی خبریں پڑھنی پڑیں، تو ان حالات میں پر سکون و ہر فکر سے آزاد بچپن کی یادیں کیا قیامت ڈھاتی ہوں گی؟ ہر خبر کو پڑھ کر پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے، تو بے اختیار بچپن کا زمانہ یاد آجاتا ہے، کیونکہ بچپن میں نہ کسی خبر کو پڑھتے تھے اور نہ حالات پر کڑھتے تھے۔ صرف مجھے ہی نہیں، ہر شخص کو اپنے بچپن کے بیتے ہوئے لمحات کے چھن جانے کا بے انتہا افسوس ہوتا ہے، کاش پھر سے لوٹ آئیں بچپن کے وہ سہانے دن، لیکن خدا تعالیٰ کا ایسا قانون نہیں۔ اگر شمس و قمر کی گردش اور رات دن کا لوٹنا ممکن ہوتا تو رو دھو کر خدا تعالیٰ سے اپنا پر سکون بچپن مانگ لیتے، لیکن اب نہ تو شمس و قمر کی گردش بدل سکتی ہے اور نہ ہی ماضی لوٹ سکتا ہے۔ اب تو بس یادیں ہی یادیں ہیں قبر تک۔ جن کو یاد کر کے بے اختیار زبان سے نکلتا ہے۔

میرے بچپن کے دن، کتنے اچھے تھے دن
آج بیٹھے بٹھائے کیوں یاد آگئے

بچپن کا سنہرا دور

میرا تعلق اس نسل سے ہے۔۔۔

جہاں صبح اسکول جانے سے پہلے popy the sailor اور pink panther دیکھا جاتا تھا۔۔۔

جہاں شام کو چار بجے پی ٹی وی پر "کھل جا سم سم" اور "عینک والا جن" کے لیے سب گلی کے بچے ایک گھر میں جمع ہو جاتے تھے۔۔۔

جہاں صوفے کے گھر بنا کر "گھر گھر" کھیلا کرتے تھے۔۔۔

میرا تعلق اس نسل سے ہے جب سارے گلی کے بچے جمع ہو کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔۔۔ جہاں گھر میں جانے کا آوٹ اور جو پھینکے گا وہی لے کر آئے گا" والا رول ہوا کرتا تھا۔۔۔

جہاں چھوٹے بچوں کی "ک" "" سے "کچی" ہوا کرتی تھی۔۔۔

جہاں "کھو پہ کھو" "کوڑا جمال شاہی" "چھپن چھپائی" "پکڑن پکڑائی" اور برف پانی کھیلنے کے لیے "پگم" کی جاتی تھی۔

جہاں مٹی کے کھلونے مل کر بنایا کرتے تھے۔۔۔

اور سورج ڈھلتے ہی سب ایک دوسرے کی قمیض پکڑ کے ٹرین بنا کر سب کو گھر چھوڑ کے آیا کرتے تھے۔

جہاں نوجوان لڑکیاں گھروں کی منڈیروں پہ چڑھ کر بڑی منتیں کر کے گولا گنڈا منگوایا کرتی تھیں۔۔۔

جہاں ڈائجسٹ منگوانے کے لیے ایک روپے کی رشوت بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔۔۔

میرا تعلق اس نسل سے ہے جہاں سب گھر والے شام کو ایک جگہ اکٹھے بیٹھ کر دن بھر کی داستان سنایا کرتے تھے۔۔۔

جہاں سب ایک ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ڈرامہ "دھواں" دیکھا کرتے تھے۔۔۔

میرا تعلق اس نسل سے ہے جہاں "Tom and jerry" ہر عمر کے لوگ بہت شوق سے دیکھا کرتے تھے۔۔۔

جہاں چودہ اگست پہ گھر کو سجانے کے لیے گھر کا ہر فرد دھاگے میں جھنڈیاں پرویا کرتا تھا۔۔۔

جہاں کسی بچے کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ ہمارے ساتھ کھیلنے والا لڑکا ہے یا لڑکی!!!

میرا تعلق اس نسل سے ہے جہاں آج بھی یہ مانا جاتا ہے کہ اللہ اولاد بزرگوں کی دعاوں سے دیتا ہے۔۔۔
میرا تعلق اس سنہرے دور سے ہے جس سے آج کی نسل محروم ہے۔۔۔

گلاب لمحوں کے مخمل پر کھیلتے بچپن، پلٹ کر آ۔۔۔۔۔۔کہ تجھ سے شرارتیں مانگوں

جوں جوں انسان 55 کی طرف بڑھتا ہے، بچپن زیادہ شدت سے یاد آنا شروع ہو جاتا ہے، 40 سال قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے، بڑے بوڑھوں کے گرد بیٹھ کر کہانیاں سننے کا بے تابی سے انتظار کیا جاتا تھا

ممتاز شیریں*

دوحہ۔ قطر۔

(**پہلی قسط**)

* "چلو بچپن کو اپنے ہم، ذرا پھر سے بلاتے ہیں

* چلو آج یونہی کرتے ہیں، کوئی عہد، نہ کوئی پیماں

* یونہی ہاتھوں میں ہاتھ دے کر، کسی دیرینہ رستے پر

* کسی انجان منزل کو، چلو آؤ نکلتے ہیں

* کہیں ساحل پہ سمندر کے، گھروندہ اک بناتے ہیں

* سجاتے ہیں، سنوارتے ہیں

* چلو یہ کھیل کھیلتے ہیں، چلو آج یونہی کرتے ہیں

* چلو آج مل کر بیٹھتے ہیں اور بچپن کو اپنے ہم

* ذرا آواز دیتے ہیں۔"

* میرا بچپن۔۔۔* !

بچپن کا حساب کچھ یوں ہے کہ جوں جوں انسان پچپن کی طرف بڑھتا ہے بچپن زیادہ شدت سے یاد آنا شروع ہو جاتا ہے۔یوں تو ہر دور کے بچوں کا بچپن تقریباً یکساں ہی گزرتا ہے مگر چونکہ ہر فرد منفرد ہے تو ہر ایک کی کہانی بھی علیحدہ ہوتی ہے آج سے تین چار عشرے قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے۔اس وقت موبائل فونز اور طرح طرح کی ڈیوائسیس کا عفریت گھروں میں داخل نہیں ہوا تھا۔اس وقت کے بچوں کے پاس کہانیاں سنانے والی نانی اور دادی ہوا کرتی تھیں۔ہمیں بھی ہر بچے کی طرح کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔ہماری نانی اماں ماموں جان کے پاس رہا کرتی تھیں اور مہینے میں ایک دفعہ ہمارے گھر یعنی اپنی بیٹی کے یہاں بھی کچھ دنوں کے لئے آیا کرتی تھیں۔بچوں اور بوڑھوں کی دوستی تو ویسے بھی مشہور ہے کہ بچہ اور بوڑھا برابر ہوتا ہے۔دونوں کو "لوگ کیا کہیں گے" سے زیادہ "جہاں اور جیسا ہے" کی پالیسی پسند آتی ہے۔لہذا ہم بھی اپنی نانی جان کا انتظار بہت بیتابی سے کیا کرتے تھے اور وجہ ان کی کہانیاں ہوتی تھیں جو ہم رات کو ان کے بستر کے گرد بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔کچھ کہانیاں انسان کی پرورش اور تربیت کے دوران اس کے خون میں شامل ہو کر اس کے ساتھ ساتھ عمر کا سفر طے کرتی ہیں اور زندگی گزارنے کے ہنر یا گرہ کے طور پر انسان پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں اب اس طرح کی کہانیاں ناپید ہو چکی ہیں جو زندگی میں انسان کی جڑوں کو ہرا بھرا رکھنے کا کام کرتی تھیں۔

میری نانی اماں اس زمانے کی تھیں جب کہانیاں الف لیلوی طرز پر ہوا کرتی تھیں اور ہزار راتوں پر محیط ہوتی تھیں۔نانی اماں ہمیں وہ کہانیاں اک عجیب انداز میں سنایا کرتی تھیں اور آخر میں وارننگ دینے والے انداز میں کہا کرتی تھیں "تو ڈرو اُس دن سے" یوں کہانی کی صورت میں "ڈرو اُس دن سے" دھیرے دھیرے ہمارے خون میں سرایت کرتا ہماری رگوں میں اتر گیا یہ وہ عمر تھی جب یہ سمجھ نہیں تھی کہ گناہ کیا ہوتا ہے یا گناہ گار کیسا ہوتا ہے بس اللہ کا ڈر تھا جو خون میں حلاوت کر گیا تھا۔۔۔ آج جب میں اپنے ارد گرد کا ماحول،لوگوں کا رویہ، ملکی اور سماجی حالات کو دیکھتی ہوں تو وہ کہانیاں میرے اندر ایک مضطرب سی کروٹ لیا کرتی ہیں۔۔۔ اپنے بچپن کے دنوں کی ایک شرارت یاد آ رہی ہے۔۔۔ اس وقت ہماری عمر سات یا آٹھ سال کی ہو گی ہماری نانی جان کچھ دنوں کے لئے رہنے آئی ہوئی تھیں نانی اماں کو اس بات سے بڑی چڑ تھی کہ ان کی چپلیں کوئی اور پہن لے اور ہمیں گھر بھر میں سب سے پیاری چپل نانی اماں ہی کی لگا کرتی تھی۔۔۔ صاف ستھری۔۔۔ چھوٹی سی۔۔۔پیاری سی۔۔۔ہماری نانی اماں بوٹے سے قد کی بہت نفیس خاتون تھیں۔اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائیں (آمین) تو ان کے گھر آتے ہی ہم ان کی چپلوں کی تاک میں رہا کرتے تھے۔

بے چاری نانی اماں اپنی چپل نہ پہننے کے رشوت میں ہمیں آتے ہی اٹھنی دے دیا کرتی تھیں (اب آج کے بچوں کو کیا معلوم کہ اٹھنی کیا ہوتی ہے؟ ان کیلئے عرض ہے کہ ایک روپے کا آدھا یعنی آٹھ آنے ہوتے تھے۔ آج کے 10 روپے کے ہم پلہ سمجھ لیں) ہم شرارت میں اکثر ان کی چپل پہن کر باہر کھیلنے چلے جایا کرتے تھے۔ اس وقت وہ بے چاری ایک تاریخی جملہ بولا کرتی تھیں "اسی لئے آتے ہی اس کو اٹھنی دے دیتے ہیں کہ ہم کو ستائے گی نہیں۔" *گلاب لمحوں کے مخمل پر کھیلتے بچپن *پلٹ کر آ۔۔۔۔۔۔ کہ تجھ سے شرارتیں مانگوں

* بچپن انسان کی زندگی کا واحد حسین دور ہوتا ہے اور تقریباً سب ہی اپنے بھولپن، شرارتوں، اور بے فکری کے اس زمانے کو یاد کرتے ہیں ہم اپنے بچپن کی یادوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ کہیں نہ کہیں ہمارے لاشعور میں موجود ہوتی ہیں۔۔۔ہاں۔۔یہ زندگی کی پریشانیاں اور مصروفیات میں دھندلا ضرور جاتی ہیں لیکن ختم نہیں ہوتیں۔

* جب بچے تھے تو دعا کیا کرتے تھے کہ کاش جلدی سے بڑے ہو جائیں اور آج جب بڑے ہو گئے ہیں تو دہائیاں دیتے پھرتے ہیں کہ۔

" * شب ہائے عیش کا وہ زمانہ کدھر گیا۔۔؟

* اور صبح کا وہ وقت سہانا کدھر گیا۔۔؟

* وہ دن کہاں گئے۔۔؟ وہ زمانہ کدھر گیا۔۔؟

* بچپن کے کھیل کود، جوانی کے ذوق وشوق

* سب خواب ہو گئے، فسانے میں ڈھل گیا۔۔۔

* پڑھنے لکھنے کا شوق بہت بچپن سے گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی گھر میں کتابیں ہی کتابیں دیکھی تھیں۔ ذرا شعور کی منزل پر پہنچے تو گھر پر ایک بہترین اور معیاری لائبریری اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر طاہر مسعود کے طفیل دیکھنے کو ملی۔

الحمد للہ شوق خوب پروان چڑھا۔ میٹرک میں آتے آتے ہم ملکی اور غیر ملکی ادب پڑھ چکے تھے۔ اس وقت کتابیں پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا یہاں تک کہ ہم راہ چلتے موسم اور حالات کی پروا کیے بغیر دیواروں پر لکھے اشتہارات پڑھتے ہوئے کیچڑ میں گرنے سے لے کر گھر کا سودا جن اخبارات میں لپٹ کر آتا تھا ان اخبارات کے ٹکڑے تک پڑھتے ہوئے اپنا نقصان کر بیٹھا کرتے تھے۔

* پڑھنے کی یہ عادت آج بھی قائم ہے۔

آج بھی ہمارے سرہانے ایک کتاب دھری ہوتی ہے۔ گاڑی میں سفر کرتے کتاب ساتھ ہوتی ہے۔اس وقت کہانیاں بے دریغ پڑھنے سننے کا نتیجہ تھا کہ ہم عام زندگی میں بھی کہانیوں کی تیکنیک استعمال کرنے کی کوششیں کرتے یعنی یہ دیکھ کر کہ چھوٹی بہن نے امی کی بات نہیں مانی، کسی بات پر ضد اور بحث کی یا اپنی کسی شرارت سے امی بے چاری کو پریشان کیا(ہم تو بہت شریف بچے تھے بالکل اللہ میاں کی گائے) تو ہمارے پاس اور تو کوئی اختیارات تھے نہیں ،نہ حقوق،نہ وسائل،نہ طاقت۔۔۔ہاں ایک ہتھیار تھا۔۔۔!قلم کی طاقت۔۔۔۔!تو ہم کسی فرضی مہربان پری کی طرف سے اپنی بہن کے نام خط لکھتے۔مدعا یہ ہوتا کہ "تم نے فلاں فلاں وقت یہ اور یہ غلط حرکت کی لہٰذا تمہیں جو انعام ملنے والا تھا وہ اب نہیں ملے گا جب تک کہ تم اپنی شرارتوں سے تائب نہیں ہو جاؤ گی"۔۔۔۔

* اب آپ خود سوچیں۔۔۔۔ایک بُری سی ہینڈ رائیٹنگ میں بچکانہ اسٹائل میں لکھی گئی بات کتنے مزاح کا باعث بنتی ہو گی۔۔۔۔

* اس وقت آپ سے یہ شئیر کرنا اتنا بُرا نہیں لگ رہا مگر خود سوچیں اس وقت کتنی سبکی ہوتی ہو گی جب بڑے اس خط کو پڑھا کرتے ہوں گے۔۔۔۔

*مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے بچپن کا واحد شوق کتابیں پڑھنا اور جمع کرنا ہوا کرتا تھا۔ اس وقت تعلیم و تربیت، جگنو، بچوں کی دنیا، بچوں کا باغ ،نونہال اور آنکھ مچولی بچوں کے رسالے شائع ہوا کرتے تھے ہمارے شوق کے پیش نظر گھر پر بچوں کی دنیا، بچوں کا باغ، نونہال آیا کرتا تھا بچوں کی دنیا اور بچوں کے باغ میں زیادہ تر جن بھوتوں اور بادشاہ و شہزادے ،شہزادیوں کے قصے ہوا کرتے تھے۔ جنہیں پڑھنا ہمیں بالکل پسند نہیں تھا۔ حکیم محمد سعید صاحب کا نونہال ہمیں پسند تھا لیکن 80 اور 90 کی دہائی میں اشتیاق احمد کے ناولز نے ہمیں اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ مہینے میں 4 ناول لکھا کرتے تھے۔2 انسپکٹر جمشید سیریز کے ایک انسپکٹر کامران سیریز اور ایک شوکی برادران سیریز کا۔ لیکن ہم انسپکٹر جمشید سیریز کے دیوانے تھے اور باقاعدہ پہلے سے ان ناولوں کی ایڈوانس بکنگ کرا لیا کرتے تھے ہم آج بھی اپنے بھائی کے بعد حضرت اشتیاق احمد کو اپنا دوسرا استاد مانتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں ایک مقناطیسیت تھی۔ قاری ان کا لکھا اک اک لفظ پڑھتا تھا اور اس کی آنکھیں لوہا بن جاتی تھیں۔ وہ اس کے بعد ان کی تحریر سے نظریں نہیں ہٹا پاتا تھا۔(باقی آئندہ ہفتے)

بچپن کی یادیں

محمّد اسد اللہ

بچپن ہماری زندگی کا یقینا سنہرا دور ہے۔اس کی حسین یادیں تاعمر ہمارے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں جگمگاتی رہتی ہیں۔ انگریزی کے مشہور شاعر جان ملٹن نے اسے جنّتِ گمشدہ یعنی کھوئی ہوئی جنّت کہا ہے ۔جب بھی ہم اپنے بچپن کے بارے میں سوچتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ کاش ہم ایک بار پھر چھوٹے سے بچّے بن جائیں۔ بچپن میں ہم گھر بھر کے دلارے اور سب کی آنکھ کے تارے تھے ہر کوئی ہمیں لاڈ پیار کیا کرتا تھا۔ بچپن کی سہانی یادیں اس قدر دلکش ہوا کرتی ہیں کہ انھیں یاد کر کے شاعر بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں جب بھی اپنے بچپن کے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنے والدین کی وہ بے لوث محبّت اور شفقت یاد آتی ہے۔ نانا نانی، دادا دادی کا دلار اور ان کا ہمارے لیے فکر مند رہنا۔ ہماری تعلیم و تربیت اور کھانے پینے کی دیکھ بھال کرنا، بھائی بہنوں کا ستانا، اسکول کے کاموں میں ہماری مدد کرنا، سب یاد آتا ہے اور یاد آتے ہیں، بچپن کے وہ سارے دوست جن کے ساتھ ہم گھنٹوں کھیلا کرتے تھے۔ بچپن کے کھیل اس قدر دلچسپ ہوا کرتے تھے کہ دوستوں کے ساتھ یا میدان میں کھیلتے ہوئے ان میں مگن ہو کر کھانا پینا اور اپنے گھر جانا بھی بھول جاتے تھے۔ بچپن ہر قسم کی فکر، دشمنی کینہ، کپٹ اور برائیوں سے پاک ہوا کرتا ہے اسی لیے تو بچوں کو فرشتہ کہا جاتا ہے ۔

میں ہمارا گھر جس جگہ واقع تھا۔ اس کے قریب ایک ندی اور وسیع میدان تھا جس کے پیچھے گھنا جنگل تھا۔ میدان میں ہم طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتے اور کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں نکل جاتے، جہاں بیریوں کی جھاڑیاں اور املی کے بڑے بڑے پیڑ تھے۔ جنگل سے املی اور بیر چنتے اور دوسرے پھل پھول جمع کر لاتے۔ اکثر وہاں ہمیں اتنی دیر ہو جاتی کہ واپسی پر گھر میں امّی کی ڈانٹ سننی پڑتی۔ امّی کی ڈانٹ تو اور بھی کئی باتوں پر کھاتے رہے مگر اصل ڈر لگتا تھا ابّو کی ڈانٹ سے اسکول نہ جانے اور نماز نہ

پڑھنے پر تو یاد ہے کبھی مار بھی پڑی تھی۔
مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب ہم بیر کی تلاش میں جھاڑیوں میں گھوم رہے تھے۔ میرے ساتھ میرے دوست امجد، اسلم اور ماجد بھی تھے۔ امجد اچانک "سانپ سانپ" کہہ کر چینخ پڑا۔ یہ سنتے ہی ہمارے پیروں تلے کی زمین نکل گئی اور جب ہم سب نے قریب ہی زمین پر ایک بڑا کالا سانپ رینگتا ہوا دیکھا تو بدحواس ہو کر سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر پہنچنے تک پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک جنگل جانے کی کسی کی ہمّت نہیں ہوئی۔

اسی طرح ایک مرتبہ عید کی خریداری کے لیے امّی اور ابّو کے ساتھ بازار گئے تھے۔ شاپنگ کرتے کرتے امّی اور ابّو آگے نکل گئے اور میں ایک دکان پر کھلونے دیکھنے میں کھویا رہا۔ جب ہوش آیا تو گھبر کر ادھر ادھر ڈھونڈتا رہا۔ بہت دیر تک روتا ہوا بھٹکتا رہا۔ آخر قریب کی ایک مسجد سے جب اعلان ہوا تو کچھ لوگ مجھے وہاں پہنچا آئے جہاں امی اور ابّو میرا بیچینی سے انتظار کر رہے تھے۔
بچپن کی یادوں میں دوستوں کے ساتھ ہونے والی لڑائیاں بھی ہم کبھی نہ بھول پائیں گے۔ اسکول میں نئے نئے دوست بن گئے تھے۔ ان کے ساتھ خوب شرارتیں کرتے۔ ذرا سی بات پر کٹّی کر بیٹھتے، لیکن زیادہ دنوں تک اس حالت میں دوست سے دور رہنا مشکل ہو جاتا اور کسی نہ کسی بہانے سے دوستی کر بیٹھتے۔ بچپن ان تمام برائیوں سے دور تھا جو انسان سے خوشیاں چھین لیتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں کسی کے لیے برائی نہ تھی۔ بچپن ایسی ہی معصوم یادوں سے عبارت ہے۔ اسی لئے ہر شخص کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے کہ کاش اس کے بچپن کے وہ سہانے دل کسی طرح لوٹ آئیں۔ لیکن یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

اب بھی بچپن کے دوست یاد آتے ہیں۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات یاد آتے ہیں تو ان کے چھن جانے کا افسوس ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سے ہمارا بچپن نہیں کوئی قیمتی سرمایہ چھن گیا ہو۔ کاش پھر سے لوٹ آئیں بچپن کے وہ سہانے دن

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے

کشمیر پاکستان کے بغیر اور پاکستان کشمیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس موقع پر قائد اعظمؒ کے الفاظ یاد آتے ہیں کہ "کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے"۔ یہ حقیقت ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کشمیر اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت ہم سے جداء نہیں کر سکتی۔ بھارتی غیر قانونی مقبوضہ جموں وکشمیر کی آزادی سے پاکستان کی تکمیل ہو گی۔ بھارت مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر کے اپنی روایتی مکاری کا انمٹ ثبوت دے چکا ہے۔ پاکستانیوں اور کشمیریوں کے درمیان مذہبی، ثقافتی اور سماجی ہم آہنگی کی پہچان ہے۔

کشمیری مسلمانوں نے قیام پاکستان سے قبل ہی اپنا مستقبل نظریاتی طور پر پاکستان کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ ہمیں اس تاریخی فیصلے پر فخر ہے کیونکہ اہل پاکستان نے آزمائش اور مشکل کے ہر لمحے میں کشمیری عوام کو کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔ دنیا کو بتا دیں کہ کشمیر کل بھی ہمارا تھا اور کشمیر آج بھی ہمارا ہے۔ کشمیری عوام کے ساتھ تھے، ہیں اور رہیں گے۔ کشمیر کا بچہ بچہ پاکستان کے شانہ بشانہ ہے۔

چونکہ پاکستان کے کار پردازوں کو بھارت پر کبھی اعتماد نہیں رہا اور ایک قسم کا خوف بھی طاری رہا۔ اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ کوئی تیسرا فریق مداخلت کر کے مسئلہ کشمیر کے حل میں مدد دے۔ کشمیر کے تنازعہ کی ابتدا میں ہی یعنی 1947ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے جو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے، برطانیہ سے مداخلت کی درخواست کی کہ وہ اس مسئلہ میں مداخلت کرے تا کہ دولت مشترکہ کے ممبر دو ممالک کے درمیان اختلافات طے ہو سکیں۔ لیکن بھارتی ہٹ دھرمی کہ وہ کسی تیسری قوت کی مداخلت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا کیونکہ ملک بھارت چاہتا تھا کہ یہ معاملہ جوں کا توں رہے۔ جو کہ اُس وقت سے لے کر آج تک کشمیر کا معاملہ لٹکا ہوا ہے جبکہ بھارت کشمیر کے مسئلہ کا حل نہیں چاہتا ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے ظلم و استبداد انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور جموں و کشمیر کی الگ حیثیت ختم کر کے مودی سرکار اپنی ہٹ دھرمی کا انمٹ ثبوت دے چکی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی آزادی کیلئے تحریک پاکستان کے جذبے کی ضرورت ہے۔ 1947ء کے بعد قوم آج پھر اسی آزمائش سے گزر رہی ہے۔ ہمیں آج پھر اپنے ذاتی اختلافات کو بھلا کر ایک ہونا ہو گا۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج نے ظلم و جبر کا ایسا کوئی ہتھکنڈہ نہیں چھوڑا جو بے گناہ اور بے سروسامان کشمیری عوام پر آزمایانہ گیا ہو لیکن کشمیری عوام جرات، پامردگی اور حوصلے سے اپنے موقف پر قائم ہیں۔ انہوں نے اپنے نصب العین کو نہیں چھوڑا۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہونگے۔ برہان مظفر وانی شہید کے مشن کو لے کر نوجوان نسل سر بکف ہو گئی ہے۔ بھارت مقبوضہ کشمیر میں کشمیریوں کی نسل کشی کا مکروہ فعل بند کرے۔ گجرات کا قصائی نریندر مودی مقبوضہ کشمیر کا قصاب بن چکا ہے۔

کشمیریوں کی لازوال قربانیوں کے بعد اب وہ دن دور نہیں جب کشمیر پاکستان کا حصہ بنے گا۔ مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مسلمان ہر روز بھارتی ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہے "کشمیر بنے گا پاکستان"۔ بھارت کے حالیہ انتہا پسندانہ اقدامات کے بعد نہ صرف مقبوضہ کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزادی ملے گی بلکہ بھارت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، اس کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور ایسا ہونے میں کوئی زیادہ عرصہ بھی نہیں لگے گا۔ بھارت کے اندر ایسی تحریک شروع ہو چکی ہے جو اب اس کے قابو میں نہیں آرہی ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں کرفیو نافذ ہوئے 200 سے زائد دن ہو چکے ہیں مگر بھارت اپنے مقاصد کے حصول میں ایک فیصد بھی کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ کشمیریوں کا جذبۂ حریت جواں ہے اور وہ اپنی تحریک اسی شدت سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ کشمیریوں کی تحریک جلد کامیابی سے ہمکنار ہو گی۔ بھارت نے 13 ماہ سے زائد عرصہ سے لاکھوں کشمیریوں کو کرفیو کے ذریعے بھوکا پیاسا قید کر رکھا ہے لیکن بہادر کشمیری آج بھی آزادی کے لیے دس لاکھ بھارتی فوج کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔

ہم بھارت پر واضح کرتے ہیں کہ وہ کشمیریوں کے بنیادی حق، حق خودارادیت میں رکاوٹ نہ بنے بلکہ سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذاکرات کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرے۔ کشمیری عوام ریاست جموں و کشمیر کو ناقابل تقسیم وحدت سمجھتے ہیں۔ ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ کشمیری عوام کیلئے وہی حل قابل قبول ہو گا جو کشمیری عوام کی خواہشات اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہو گا اور یہی اس کا دیرپا اور پائیدار حل ہو گا۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ پاکستان نے کبھی یہ نہیں کہا کہ کشمیر کو پاکستان کے حوالے کر دیا جائے بلکہ پاکستانی عوام اور حکومتوں کا تو ہمیشہ سے یہ موقف رہا ہے کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیریوں کی رائے معلوم کر لی جائے کہ وہ اپنا مستقبل کیسا چاہتے ہیں مگر دہلی کا بالا دست طبقہ چونکہ بخوبی جانتا ہے کہ کشمیری عوام ہر قیمت پر بھارت سے نجات کے خواہاں ہیں اسی وجہ سے بھارت سلامتی کونسل کی قراردادوں کو نہیں مان رہا اور امریکہ سمیت عالمی برادری کے اکثر حلقے سب کچھ جانتے ہوئے بھی چشم پوشی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ایسٹ تیمور، جنوبی سوڈان، لیبیا، عراق اور شام کی بابت تو سلامتی کونسل کی قراردادوں کے نام پر ہر قسم کا سخت رویہ روا رکھا جاتا ہے مگر بھارتی حکمرانوں سے ان کے دوہرے معیار کی بابت کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔

اقوام متحدہ بھی اپنی قراردادوں پر عملدرآمد کرائے۔ کشمیر کا جو حصہ آزاد نہیں ہوا کشمیریوں کا ان کا بنیادی حق خود ارادیت دیا جائے۔ تاکہ کشمیری آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔ اقوام متحدہ یہودیوں کی ایجنٹ بننے کے بجائے اپنی قراردادوں پو عملدرآمد کروائے۔ مقبوضہ کشمیر میں جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اسرائیل میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ عالمی برادری فوری نوٹس لے۔

کشمیر تو ہماری شہ رگ ہے

کشمیر کی آزادی پاکستان کے ساتھ الحاق کشمیریوں کی تمنا ہے۔ آزادی کے حصول تک کشمیری کسی بھی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ بھارتی سامراج کشمیر کو کسی بھی صورت اپنے پاس قابض نہیں رکھ سکتا۔

قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے 1926ء میں کشمیر کا دورہ کیا اور وہاں کشمیری زعما سے ملاقاتیں بھی کیں۔ اسوقت اگرچہ کشمیر میں تحریک حریت کے خدوخال تو زیادہ نمایاں نہیں تھے لیکن کشمیری مسلمانوں کی حالت زار دگر گوں تھی اور انہیں ہندوؤں کے مقابلے میں دوسرے تیسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا تھا۔ قائداعظمؒ دوسری بار 1929ء تیسری بار 1936ء اور چوتھی بار 1944ء میں کشمیر گئے جہاں آپ نے نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کے اجلاسوں سے خطاب بھی کیا اور کم و بیش ڈیڑھ ماہ کے لگ بھگ کشمیر میں قیام کیا۔ قائداعظمؒ 47-1946ء میں بھی کشمیر جانا چاہتے تھے لیکن مصروفیات کے باعث نہ جا سکے۔

1935ء میں قائداعظمؒ کے دورہ کشمیر پر ایک عظیم الشان جلسہ سرینگر پتھر مسجد میں منعقد ہوا جس میں چوہدری غلام عباس نے سپاسنامہ پڑھا۔ قائداعظمؒ نے اپنے خطاب میں کہا "میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آزادی کیلئے آپ کی جدوجہد اور برٹش انڈیا میں میرے معاملات کے ساتھ اپنی ہمدردی اور نیک خواہشات ظاہر کریں گے۔ یقینا آپ ایسا کریں گے"۔ یہ وہ وقت تھا جب قائداعظمؒ نے ایک سال بیشتر مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تھی اور آپ تمام برصغیر میں مسلم لیگ کی تنظیم نو میں مصروف تھے۔ دوسری طرف کانگریس مسلمانوں کو اپنے اندر ضم کرنے کیلئے کوشاں تھی۔

23مارچ 1940ء کو قائداعظمؒ کی قیادت میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا اور اس تاریخ ساز اجلاس میں اتفاق رائے سے قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ مئی 1944 میں قائداعظمؒ نے کشمیر کا تیسری بار دورہ کیا۔ قائداعظمؒ نے کشمیر میں اڑھائی مہینے قیام فرمایا اور اس دوران انہوں نے کشمیری عوام اور ان کے راہنمائوں کو بہت قریب سے دیکھا اور انہیں یقین آگیا کہ جموں کشمیر کے مسلمانوں کے دلوں

میں پاکستان کی محبت ناقابل تسخیر ہے۔ جموں کے عید گاہ میدان میں قائد اعظمؒ نے فرمایا "جموں کشمیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی ان بے انصافیوں کا رد عمل ہے جو ایک صدی سے ان پر روا رکھی گئی ہیں۔

جون 1944 میں مسلم کانفرنس کا سالانہ جلسہ قائد اعظمؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ چوہدری غلام عباس کے سپاسنامے کے بعد قائد اعظمؒ نے کشمیریوں سے خطاب فرمایا "جب میں اس جلسے پر نگاہ ڈالتا ہوں مجھے خوشی ہوتی ہے اور یقین ہوتا ہے کہ مسلمان اب جاگ اٹھے ہیں اور وہ مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے کھڑے ہوگئے ہیں۔ میں ایک مہینے سے یہاں مقیم ہوں اور اس عرصے میں میرے پاس ہر خیال کے آدمی آئے ہیں میں نے دیکھا کہ 99 فیصد جو میرے پاس آئے ہیں مسلم کانفرنس کے حامی ہیں۔ میں آپ کو ہدایت دیتا ہوں کہ آپ صاف صاف اور کھلے الفاظ میں اعلان کریں کہ ہم مسلمان ہیں۔ عزت کا صرف ایک راستہ ہے وہ ہے اتفاق و اتحاد ایک پرچم، ایک نصب العین، ایک پلیٹ فارم۔ اگر آپ نے یہ حاصل کیا تو آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ مسلم لیگ اور ہماری خدمات 'تائید و حمایت آپ کے قدموں پر ہوگی"۔

1946ء میں جب کانگریسی رہنماء جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کیلئے سخت کوششیں کر رہے تھے۔ قائد اعظمؒ نے ایک بار پھر جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی رہنمائی عطا کی۔ قائد اعظمؒ نے فرمایا "جموں کشمیر کے مسلمانوں سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ اتحاد و یگانگت کو بہر کیف بر قرار رکھیں اور چوہدری غلام عباس کی قیادت اور مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے جمع رہیں۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان تو بن گیا لیکن کشمیر لٹک گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قائد اعظم ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کے حامی نہیں تھے لیکن وہ ان ریاستوں کے حقوق کے داعی و علمبر دار تھے۔ جب کانگریس نے یہ کہا کہ ہندوستان میں صرف دو قوتیں ہیں ایک برطانوی حکومت اور دوسری کانگریس تو اسکے جواب میں قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ نہیں ہندوستان میں چار سیاسی قوتیں ہیں انگریز، کانگریس، مسلم لیگ اور ہندوستانی ریاستیں جو 571 کے لگ بھگ اور ہندوستانی آبادی کا ایک چوتھائی سے زیادہ تھی جس میں کشمیر بھی شامل تھا۔

3 جون 1947 کے تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت ریاستوں کی آزادی اور الحاق کے بارے میں جو اصول طے ہوئے تھے ان سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننا تھا لیکن جب کشمیریوں کو حق خود ارادیت کا موقع نہیں دیا گیا تو کشمیریوں نے اولاً 19 جولائی 1947ء کو الحاق پاکستان کی قرارداد منظور کی۔ بعد میں 24 اکتوبر 1947ء کو سردار محمد ابراہیم خان کی قیادت میں حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا تو 27 اکتوبر 1947ء کو ہندوستان کی افواج نے کشمیر میں مداخلت کا آغاز کیا تو قائداعظم نے فوری طور پر پاکستانی کمانڈر انچیف کو حکم دیا کہ وہ اپنی افواج کشمیر میں داخل کر دے لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ قائداعظم کے اس حکم اور کمانڈر انچیف کی طرف سے حکم عدولی کے متعدد مستند حوالے موجود ہیں۔ قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے اپنی کتاب "مائی برادر" میں بھی قائداعظم کی کشمیر سے وابستگی اور تشویش کے بارے میں جو اشارہ دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ کشمیر کے بارے میں کس حد تک فکر مند تھے۔ آپ لکھتی ہیں کہ قائداعظم کے آخری ایام میں ان پر جب غنودگی اور نیم بے ہوشی کا دورہ پڑتا تھا تو آپ فرماتے تھے کہ کشمیر کو حق ملنا چاہیے آئین اور مہاجرین کے الفاظ استعمال کیے۔

علامہ محمد اقبالؒ جو بذات خود ایک کشمیری النسل تھے، خطبہ آلہ آباد 1930ء سے قبل بھی وہ ہندوستان میں کشمیریوں کی تحریک حریت کے داعی و علمبردار رہے اور اولاً آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے سیکرٹری اور بعد ازاں کشمیر کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ علامہ اقبالؒ نے ہی 14 اگست 1934 کو کشمیریوں کیساتھ اظہار یکجہتی منانے کیلئے پورے مسلمانان ہند کو دعوت دی تھی۔ 1931ء کے واقعات جن میں سری نگر میں 22 افراد نے جام شہادت نوش کیا تھا اس واقعہ کے صدائے بازگشت کو ہندوستان تک پہنچانے میں علامہ اقبالؒ کا بہت بڑا کردار تھا۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے جب 1930 میں مسلمانان ہند کیلئے ایک الگ وطن کا مطالبہ پیش کیا تھا اسی دوران انہوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ معرض وجود میں آنے والی نئی مملکت اسلامیہ میں اگر کشمیر شامل نہ کیا گیا تو اس مملکت کو بنانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

کشمیری قوم نے آج بھی اسلام کے نام پر پاکستان سے محبت اور آزادی کے نعرے کو خون کی ندیاں عبور کرتے ہوئے گلے سے لگا رکھا ہے۔ تاریخ، حالات و واقعات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی

ہے کہ کشمیر پاکستان کا ایک حصہ ہے جس کے بغیر پاکستان کی بقاء و سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں تو پاکستان کو اپنے باقی تمام مسائل کو پس پشت ڈالتے ہوئے بھرپور کارروائی کرنی ہو گی۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کا پاکستان کشمیر کے بغیر نامکمل اور ادھورا ہے۔ مضبوط و مستحکم پاکستان ہی کشمیریوں کے مستقبل کا ضامن ہے۔ کشمیریوں کا پاکستان سے لازوال رشتہ ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کا درجہ دیا تھا۔

شہدا کا خون ضرور رنگ لائے گا اور کشمیری آزادی کا سورج ضرور دیکھیں گے۔ اقوام عالم خاموش تماشائی کا کردار چھوڑ کر کشمیریوں کو ان کا پیدائشی حق حق خودرادیت دلوانے کیلئے اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔

محمد حنیف کا کالم: 'کشمیر بنا ہے فلسطین'، کٹی ہوئی شہ رگ کا گیت

گذشتہ سال کشمیر پر مودی کے 'شب خون' کے کچھ ہفتے بعد ایک کشمیری دوست سے فون پر بات ہوئی۔ وہ سرینگر کی جم پل ہے، انڈیا کی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھ کر اور انڈیا کی کرکٹ ٹیم کو سپورٹ کر کے بڑا ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بچپن سے ہی اپنے وطن میں ہونے والے ظلم کا چشم دید گواہ بھی ہے۔

ٹارچر سیل، کرفیو، جبری گمشدگیاں، اجتماعی قبروں کا وہ ذکر ایسے ہی کرتا ہے جیسے ڈل جھیل کا یا اپنے آنگن میں لگے درختوں کے پتوں کے بدلتے رنگ کا۔

فون پر اس نے وہی کہانی سنائی جو میں اخباروں میں پڑھ چکا تھا (ہم جو بھی کہیں، بین الاقوامی میڈیا نے شروع کے چند مہینے کشمیر کو کافی تفصیلی کوریج دی۔ اس کی وجہ کوئی عالمی ضمیر نامی چیز نہیں تھی بلکہ کشمیر کے نوجوان صحافیوں اور فوٹوگرافروں کی تخلیقی کاوشیں تھی کہ عالمی میڈیا ان کی کہانی سننے پر مجبور ہوا اور پھر اچھے بچوں کی طرح کہانی سن کر سو گیا۔)

کشمیر پاکستان کی شہ رگ

نغمہ حبیب

May 201426،Monday

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے یہ جملہ قائد کا ہے لیکن حقیقت، وقت کی ہے کہ اسکے بغیر نہ تو پاکستان کا نام نہ اس نقشہ مکمل ہے۔ یوں تو بھارت میں بہت سے مسلم اکثریتی علاقے ہیں لیکن کشمیر کا مسئلہ مختلف یوں ہے کہ یہ قدرتی طور پر پاکستان کا حصہ ہے اور پاکستان کے ساتھ متصل ہے۔ پاکستان کے بیشتر دریا کشمیر سے نکلتے ہیں یعنی ان کے منبے کشمیر میں ہیں یوں پاکستان کی رگوں میں دوڑتا لہو کشمیر سے آتا ہے دوسری طرف پاکستان کشمیر کیلئے اتنا ہی اہم ہے ایک تو مذہبی رشتہ اور دوسرے ہندوستان جیسے پڑوسی کی موجودگی میں اس کے تحفظ کی ضمانت اسی میں ہے کہ وہ پاکستان کا حصہ بنے۔ پاکستانی اور کشمیری عوام کبھی ایک دوسرے کو الگ سوچ بھی نہیں سکتے اور یہی وجہ ہے کہ بھارت گذشتہ تریسٹھ سال سے جو مظالم ڈھارہا ہے اس پر پاکستانی عوام ہمیشہ دکھ کا شکار بھی ہوتے ہیں اور غم وغصے کا بھی۔ کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ کہنے والوں نے کبھی کشمیریوں کے دکھ پر دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کشمیریوں کی جدوجہدِ آزادی کو دہشت گردی قرار دینے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی دنیا کے ہر انسان کی طرح کشمیریوں کا بھی حق ہے۔ جس کیلئے وہ لوگ اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ جبکہ بھارت سرکار اس جذبۂ آزادی کو کچلنے کیلئے ایک سے بڑھ کر ایک کالا قانون آزما چکی ہے فوج کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں جس کی رو سے وہ کسی بھی کشمیری پر صرف شبہے کی بنیاد پر بھی گولی چلا دیتی ہے اور کسی کشمیری کا خون بہہ جانا بھارتی فوج کیلئے کسی پریشانی یا پشیمانی کا باعث نہیں ہوتا۔ نہ ان کیلئے یہ اہم یا سوچنے کی بات ہے کہ ان کی گولی کا نشانہ بننے والا نوجوان ہے بوڑھا ہے یا بچہ، اگر عورت بھی اس گولی کا نشانہ بن جائے تو بھی کوئی خاص بات نہیں۔ کشمیر میں بھارتی فوج نے ہر طرح سے انسانیت کی دھجیاں بکھیر دی ہیں جس طرح کسی کشمیری کی جان محفوظ نہیں ہے اسی طرح کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ صرف 2010 کے اعدادوشمار لیں تو بھارت کی عظیم جمہوریت کا پول کھل جاتا ہے۔ صرف اس ایک سال میں 447 کشمیری مسلمان بھارتی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے جبکہ 6076 عام شہری زخمی ہوئے۔ گھروں کی تلاشی بھی بھارتی فوج کا ایک پسندیدہ

مشغلہ ہے اور اسی شغل کو جاری رکھتے ہوئے 132 گھروں کی تلاشی لی گئی اور ان ساری کاروائیوں کے دوران 2188 کشمیری گرفتار ہوئے۔ ان گرفتار شدگان میں سے گیارہ زیرِ حراست افراد غائب کر دیئے گئے۔ عورتوں اور بچوں کا اس صورت حال میں متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے لہٰذا عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر وہ ہوتا ہے جب عورتوں کی آبروریزی کی جاتی ہے اور کشمیر میں بھارتی فوجی مسلسل اس مکروہ فعل میں ملوث ہے صرف سال 2010 میں 87 خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ صرف دسمبر کے مہینے میں دس لوگوں کی شہادت کے ساتھ تین خواتین کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ 78 کو تشدد بنا کر شدید زخمی کیا گیا ہے۔ اگر یہ ایک سال کے اعداد و شمار ہیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر کیا صورتِ حال ہو گی۔ 2010 میں کشمیر میں بدترین کرفیو نافذ رہا۔ بین الاقوامی میڈیا کے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگائی گئی تاکہ کشمیر کے حالات کو دنیا کی نظر سے اوجھل رکھا جا سکے اگرچہ یہ کرفیو اور پابندی ہی دنیا کو جگانے کو کافی تھے تاہم انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں اس طرح سے کبھی بھی نہ چیخیں جیسے وہ کسی ایک انسان کے ساتھ زیادتی پر بھی چیخ اٹھتی ہیں درست ہے کہ ایک انسان پر بھی ظلم نہ ہو لیکن یہاں تو پورے خطے پر ظلم ہو رہا ہے۔ فوج کو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے وہ جب چاہے جہاں چاہے کسی کشمیری مسلمان کو مشکوک قرار دے کر بھون ڈالے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں خاموش اس لیے ہیں کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے قرار دادیں تو منظور کر لیں لیکن ان پر عمل درآمد کیلئے کسی قسم کا عملی کام نہ کیا اور یوں لگتا ہے کہ جب کشمیریوں کی نسل کشی مکمل ہو جائے گی تو اقوامِ متحدہ مسلمانوں سے خالی خطۂ کشمیر کے حق کیلئے بولے گا۔ دوسری جانب امریکہ کسی مسلمان ملک میں ہنگاموں اور ہڑتالوں پر بھی بولتا ہے اور حکومت کو عوامی رائے کے احترام کا درس دیتا ہے۔ مصر ہی کی مثال لیجے کہ حکومت مخالف مظاہروں پر جان کیری نے فوراً حکومت کو عوامی رائے کے احترام کا حکم دیا۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ ایسا ضروری ہے لیکن یہی فارمولا کشمیر پر کیوں لاگو نہیں کیا جاتا جہاں کے عوام اپنی نسلوں کی نسلیں قربان کر چکے ہیں جو روز سڑکوں پر ایک ہی مطالبہ لے کر نکلتے ہیں اور آزادی، آزادی کے نعرے لگاتے لگاتے ایک غیر مذہب، غاصب حکومت اور بے رحم فوج کی گولیوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اگلے دن ان شہدائ کی جگہ کئی اور غازی آزادی کا مطالبہ لے کر سڑکوں پر آ جاتے ہیں یہ سلسلہ گزشتہ چھ دہائیوں سے جاری ہے لیکن نہ عالمی طاقتوں کے کان پر جوں رینگ رہی ہے نہ بھارت

کوئی ارادہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ کشمیریوں کو آزادی دے گا۔ بلکہ کشمیر پر تو پاکستان کو جو مضبوط، مؤثر اور ٹھوس مؤقف اختیار کرنا چاہیے اس میں بھی اکثر لچک پیدا کر دی جاتی ہے لچک پیدا کرنا غلط نہیں لیکن قومی مفاد پر زد تو بڑی بات ہے اس میں بال بھی آجائے تو یہ غلط ترین ہے۔ اس وقت کشمیریوں کو ہماری اخلاقی مدد کی ضرورت ہے اور ہمیں بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کو زیادہ مؤثر انداز میں اور زیادہ زور و شور سے اجاگر کرنا ہو گا۔ بھارت سے ہر قسم کے تعلقات کو اسی مسئلے سے منسلک کر دینا چاہیے اور اس سے ہر بات چیت کیلئے پہلی شرط مسئلہ کشمیر کو بنا دینا چاہیے۔ پڑوسیوں کے ساتھ امن سے رہنا ہر ملک تو ملک انسان کی بھی خواہش ہوتی ہے ملکوں کے تعلقات تو پوری قوم کے حال اور مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے ان تعلقات کا خوشگوار ہونا بہت اہم اور ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری قومی وقار اور ملکی مفاد ہے۔ کشمیر جس پر پاکستان اور بھارت کے درمیان تین کھلی جنگیں ہو چکی ہیں اور سرحدی جھڑپیں تو ایک معمول ہے۔ اس مسئلے کا حل ہونا نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت اور پوری دنیا کے حق میں ہے۔ دو ایٹمی قوتوں کے درمیان تنازعات کے نتائج سے دنیا کا محفوظ ہونا ضروری ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی تنازعہ کشمیر ہی ہے باقی تمام مسائل اسی مسئلے سے جڑے ہوئے ہیں کیونکہ پاکستان اور پاکستانیوں کا مطالبہ انتہائی منطقی اور جائز ہے کہ وہ اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے حقِ خود ارادی کیلئے ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں جن کے دل مسلمان ہونے کے ناطے ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ بین الاقوامی برادری کو اس سلسلے میں پاکستان اور کشمیریوں کے مطالبات ماننے کیلئے بھارت کو مجبور کرنا ہو گا۔

کشمیر پاکستان کی شہہ رگ ہے

تحریر:۔ محمد رجاسب مغل ۔۔ بریڈ فورڈ

کشمیریوں سے اظہار یکجہتی کے لئے دنیا بھر میں 5 فروری کو کشمیر ڈے منایا جاتا ہے۔ ہر سال پوری دنیا کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے، اس کا تحفظ ہر پاکستانی کا فرض ہے کیونکہ اسی میں پاکستان کی بقا ہے۔ ہر سال اس دن کو جوش جذبے کے ساتھ منا کر اپنے کشمیری بھائیوں کو یاد دلایا جاتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ہم ان کی آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادیں گے۔ بھارت کے ظلم و بربریت کو دنیا بھر کے سامنے لانے کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم ایک ہیں اور کشمیر ہمارا ہے۔ ہمارا صرف ایک ہی نعرہ ہے۔ کشمیر بنے گا پاکستان 5 فروری کو منائے جانے والے یوم یکجہتی کشمیر کے موقع پر نہ صرف پورا پاکستان بلکہ پورا آزاد کشمیر بھی اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں سے مکمل طور پر اظہار یکجہتی کا اعلان کرتا ہے کشمیریوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کسی ایک دن کی محتاج نہیں نعروں کی دنیا سے نکل کر عملی طور پر کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس شہ رگ کو بھارت نے گزشتہ چھ ماہ سے دبوچا ہوا ہے کشمیر کی شناخت کو آرٹیکل 370 منسوخ کرکے ختم کردیا اور بڑے فخر سے پوری دنیا کو دکھا رہا ہے کہ ہے کسی میں ہمت ہے جو اس شہ رگ کو بھارتی پنجہ استبداد سے آزاد کرائے ہم سب کے لیے لمحہ فکر ہے بھارتی وزیر اعظم نے گزشتہ برس

ٹیکساس میں ٹرمپ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پاکستان پر طعنوں کے تیر برساتے ہوئے جس طرح پاکستان کی ایٹمی طاقت کو للکارا اور عالمی برادری کو اپنا ہمنوا بنا کر کشمیر کے مسلۓ پر خاموش کرا دیا وہ ہماری خارجہ پالیسی پر سوالیہ نشان ہے کشمیر کو آزاد کرانا تو دور کی بات مقبوضہ کشمیر میں چھ ماہ سے جاری کرفیو تک کو ختم نہ کرا سکے کشمیری آج بھی محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں ہیں جو انہیں بھارتی ظلم سے نجات دلا سکیں۔ کشمیری حریت پسند، اپنی آزادی کی یہ جنگ گزشتہ 70 سال سے بدستور لڑ رہے ہیں جس کی پاداش میں 40 لاکھ سے زائد کشمیری بے گھر ہو چکے ہیں جبکہ ڈیڑھ لاکھ سے زائد لوگ آزادی کی اس راہ میں جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ 70 سال سے وہاں تعینات بھارتی فوجیوں، اسپیشل فورسز اور پولیس نے، جن کی تعداد آج 8 لاکھ سے زائد ہو چکی ہے، مسلمان نہتے کشمیریوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ روزانہ کی بنیادوں پر وہاں خواتین کی عصمتیں تار تار کی جارہی ہیں، ماؤں

اور بہنوں سے ان کے سہاگ چھینے جا رہے ہیں، لاکھوں بچے یتیم ہو چکے ہیں مگر آج بھی ان کشمیریوں کے لب پر ایک ہی صدا گونج رہی ہے: "کشمیر بنے گا پاکستان"، "کشمیر کا بچہ بچہ آج بھی کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہی تسلیم کرتا ہے مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے نام پر شہادت پانے والوں کو آج بھی پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر سپرد خاک کیا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں پاکستان ہی کشمیریوں کا واحد وکیل ہے جو ہر محاذ پر کشمیر کا مقدمہ لڑ رہا ہے مگر افسوس پاکستان اندرونی طور پر جس طرح سیاسی خلفشار کا شکار ہے عالمی طاقتوں نے دہشت گردی کی جنگ میں دھکیل کر پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کیا تحریک کشمیر کیلئے وہ کردار ادا نہیں کر سکا جو کہ ہونا چاہیے تھا پاکستان میں آنے والی حکومتوں نے سوائے لفظی جنگ اور مسئلے کو عالمی فورم کے اٹھائے جانے کے، اور کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔اسی بناء پر آج بھی مقبوضہ کشمیر اسی جگہ کھڑا ہے جہاں 70 سال قبل کھڑا تھا۔

کشمیر پاکستان کی شہ رگ عاصم مجید کا بلاگ

کشمیر پاکستان کی شہ رگ عاصم مجید

یہ جملہ میرا نہیں بلکہ ایسے دور اندیش شخص کا ہے جس کی بصیرت کی گواہی زمانہ دیتا ہے۔ جی ہاں ! بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا
کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔
اس وقت ہر صاحب بصیرت کشمیر کی پاکستان کے لیے اہمیت کو جانتا ہے۔
آزادی کشمیر ہی

ہمارے آزاد پانیوں کی ضمانت

سی پیک کی کامیابی کی ضمانت

ڈیموں کی تعمیر کی ضمانت

معدنیات کے حصول کی ضمانت

سیاحتی کاروبار کی ضمانت

پاکستان معیشت کی کامیابی کی ضمانت

اس میں کوئی شک نہیں آزادی کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل ہے۔ کشمیری اپنے خون سے تکمیل پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔
میرے ہم وطنوں کشمیری خون بہا رہے ہیں وہ ہماری جنگ کے لیے شہادتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی گھر ہو جس میں کوئی شہید نہ ہو۔ شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جس میں کسی ہماری ماں یا بہن کی عزتوں سے نہ کھیلا گیا ہو۔ کشمیر لفظ مظلومیت کا استعارہ بن چکا ہے۔
کشمیری شہادتوں پر شہادتیں پیش کر رہے ہیں وہ اپنے لاشے پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر دنیا بھر کے انسانوں کو فیصلہ سنا رہے ہیں کہ کشمیریوں کا مستقبل پاکستان سے جڑا ہے۔ ان کے تین تین سال کے بچے پکار رہے ہیں

ہم چھین کے لیں گے آزادی

ہے حق ہمارا آزادی

آئیں اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی آواز پر لبیک کہیں۔ مسلمان تو ویسے بھی جسد واحد کی طرح ہوتے ہیں۔

قرآن اس کے متعلق فرماتا ہے۔

وَاِنِ اس ْتَن ْصَرُو ْکُم ْفِی الدِّی ْنِ فَعَلَی ْکُمُ النَّص ْرُ

"اگر وہ دین کے بارے میں مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا ضروری ہے"(الانفال،72)

آو میرے پاکستانیو!

کشمیریوں کی پکار کا جواب دیں

اپنے مال سے

اپنی دعاوں سے

سوشل میڈیا کی آواز سے

پر امن احتجاج سے

آئیں دنیا کے ضمیر کو جنجھوڑ ڈالیں۔ سوشل میڈیا ایک پانچویں نسل کی جنگ اس کو ہلکا نہ لیں اس محاذ پر کشمیریوں کی آواز دنیا بھر میں پھیلا دیں۔ فیس بک، ٹویٹر انسٹا گرام ان کو تفریح کے لئے نہیں بلکہ آزادی کشمیر کی تحریک کے لیے استعمال کریں۔

میرے ہم وطنوں کشمیری سات دہائیوں سے اپنا خون پیش کر رہے ہیں آئیں ہم ان کے لیے پسینے بہالیں۔ وہ کسی محمد بن قاسم، خالد بن ولید اور صلاح الدین ایوبی کو پکار رہے ہیں۔ آئیں اپنے ذاتی، سیاسی اور معاشی اختلافات بھلا کر متحد ہو کر آواز بلند کریں۔ کیونکہ جن کی شہ رگ دشمن کے قبضے میں ہو وہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتے۔

میری ارباب اختیار سے گزارش ہے سفارتی زرائع کا بھرپور استعمال کریں۔ دنیا کے منصفوں کو بتا دیں

کشمیری ہمارے بغیر نہیں رہ سکتے اور ہم کشمیریوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم تب تک سکون سے نہیں بیٹھیں کے جب تک پاکستان مکمل نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ

ابھی تکمیل باقی ہے
ابھی کشمیر باقی ہے

اور اگر دنیا کے کان میں جوں نہیں رینگتی تو پھر جیسے میجر جنرل آصف غفور صاحب نے کہا:
کہ ہم پاکستانی آخری گولی ، آخری سپاہی اور آخری سانس تک کشمیریوں کے لیے لڑیں گے۔
مودی سن لے!!

اِس پار ملی تھی آزادی
اس پار بھی لیں گے آزادی
ان شا اللہ

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے

تحریر　　　　:مہر　　　　اشتیاق　　　　احمد

قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اپنی وفات سے چند روز قبل یہ فرمایا تھا کہ ”کشمیر سیاسی اور قومی اعتبار سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔کوئی خود دار ملک اور قوم یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے حوالے کردے۔“(کتاب قائد کا پیغام،مرتب سید قاسم محمود صاحب،پاکستان اکیڈمی،6شارع فاطمہ جناح لاہور)3جون 1947ء کے تعمیر بند کے فارمولے کے تحت ریاستوں کی آزادی اور الحاق کیبارے میں جو اصول طے ہوئے تھے۔اُن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنتا تھا۔ لیکن جب کشمیروں کو حقِ خود ادادیت کا موقع نہیں دیا گیا تو کشمیروں نے اولاً19جولائی 1947ء کو الحاق پاکستان کی قرارداد منظور کی۔بعد میں 24اکتوبر 1947ء کو سردار محمد ابراہیم خان کی قیادت میں حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے اپنی کتاب ”مائی برادر“ میں بھی قائد اعظم محمد علی جناح کی کشمیر سے وابستگی اور تشویش کے بارے میں جو اشارہ دیا ہے۔اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائد اعظم کشمیر کے بارے میں کس حد تک فکر مند تھے۔آپ لکھتی ہیں کہ قائد اعظم کے آخری ایام میں ان پر جب غنودگی اور نیم بہوشی کا دورہ پڑتا۔تو آپ فرماتے تھے کہ کشمیر کا حق ملنا چاہیے۔ انہوں نے آئین اور مہاجرین کے الفاظ استعمال کیے۔قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے 1926ء میں کشمیر کا دورہ کیا اور وہاں کشمیری رہنماؤں سے ملاقاتیں بھی کیں۔اُس وقت اگرچہ کشمیر میں تحریک حدیث کے خدو خال زیادہ نمایاں نہیں تھے۔لیکن کشمیری مسلمانوں کی حالت دگر گوں تھی اور انہیں ہندوں کے مقابلے میں دوسرے تیسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا تھا۔قائد اعظم محمد علی جناح دوسری بار 1929ء تیسری بار 1936ء اور چوتھی بار 1944ء میں کشمیر گئے۔جہاں آپ نے نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کے اجلاسوں سے خطاب بھی کیا اور کمو پیش ڈیڑھ ماہ کے لگ بھگ کشمیر میں قیام کیا۔قائد اعظم محمد علی جناح 1946-47 میں بھی کشمیر جانا چاہتے تھے۔لیکن مصروفیت کے باعث نہ جا سکے۔1935ء میں قائد

اعظم کے دورہ کشمیر پر ایک عظیم و شان جلسہ سرینگر پتھر مسجد میں منعقد ہوا۔ جس میں چوہدری غلام عباس نے سپاسنامہ پڑھا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے خطاب میں کہا"میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کے آزادی کے لیے آپ کی جدوجہد اور برٹش انڈیا میں میرے معاملات کے ساتھ اپنی ہمدردی اور نیک خواہشات ظاہر کریں گے۔ یقیناً آپ ایسا کریں گے۔ یہ وہ وقت تھا جب قائد اعظم نے ایک سال پہلے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تھی اور آپ تمام برصغیر میں مسلم لیگ کی تنظیم نو میں مصروف تھے دوسری طرف کانگریس مسلمانوں کو اپنے اندر ضم کرنے کیلئے کوشاں تھی۔ جون 1944ء میں مسلم کانفرنس کا سالانہ جلسہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ چوہدری غلام عباس کے سپاسنامے کے بعد قائد اعظم نے کشمیروں سے خطاب فرمایا۔"جب میں اس جلسے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے کوشی اور یقین ہوتا ہے کہ مسلمان اب جاگ اُٹھے ہیں اور وہ مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں ایک مہینہ سے یہاں مقیم ہوں اور اس عرصے میں میرے پاس ہر خیال کے آدمی آئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ 99 فیصد جو میرے پاس صاف صاف اور کھلے الفاظ میں اعلان کریں کہ ہم مسلمان ہیں۔ عزت کا صرف ایک راستہ ہے۔ وہ ہے اتفاق و اتحاد، ایک پرچم، ایک نصب العین، ایک پلیٹ فارم اگر آپ نے یہ حاصل کر لیا تو آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ مسلم لیگ اور ہماری خدمات، تائید و حمایت آپ کے قدموں پر ہو گی۔ 1946ء میں جب کانگریس رہنما جموں کشمیر کے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کیلئے سخت کوشش کر رہے تھے تو قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے ایک بار پھر جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی رہنمائی عطا کی۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے فرمایا۔ میں جموں کشمیر کے مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اتحاد و یگانگت کو بہر کیف بدقرار رکھیں او چوہدری غلام عباس کی قیادت اور مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے جمع رہیں۔ 14 اگست 1947ء کو پاکستان تو بن گیا۔ لیکن کشمیر کا مسئلہ لٹک گیا۔ جو آج تک سرد مہری کا شکار بنا ہوا ہے۔ مسئلہ کشمیر کی سرد مہری کی وجوہات کو جاننا ہو گا کہ آخر لوگ مسئلہ کشمیر پر سرد مہری کا شکار کیوں ہیں؟ وجوہات کو جانے بغیر اس سرد مہری کا خاتمہ ممکن نہیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق 24 اکتوبر 1947ء

کو آزاد کشمیر حکومت قائم ہوئی۔ بھارت باقی ماندہ کشمیر کو بچانے کیلئے یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں لے گیا۔ اقوام متحدہ نے کشمیر میں استعواب رائے کا فیصلہ کیا جسے پاکستان اور ہندوستان دونوں نے تسلیم کیا۔ آزاد کشمیر حکومت کا اعلان در اصل مقبوضہ کشمیر کے بیس کیمپ کے طور کیا گیا تھا۔ اس ریاست نے ابھی تک چھبیس صدور کا دورانیہ گزارا ہے۔ اور مجموعی طور پر آل جموں کشمیر و کشمیر مسلم کانفرنس نے زیادہ عرصہ اقتدار میں گذارا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں بھی بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ تعلیمی اداروں میں معیاری تعلیم کی دوڑ میں آکسفور اور کیمرج کے نصاب کے چکر میں تاریخ کشمیر کو تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے۔ لوگوں کی اکثریت روزگار اور تعلیم کے حصول کیلئے مغربی ممالک کا رخ کرتی ہے۔ سیاست میں داخل ہونے کیلئے برادری ازم کے علاوہ کوئی دوسرا دروازہ کھلا ہوا نہیں ہے۔ پاکستان کی طرح ہندی فلمیں اور گانے آزاد کشمیر میں مقبولیت عام کا درجہ رکھتے ہیں۔ المختصر یہ کہ جس منطقے کو تحریک آزادی کشمیر کے بیس کیمپ کا درجہ حاصل تھا اب بھی اگرچہ عوام میں مقامی طور پر کشمیر سے جذباتی لگاؤ تو موجود ہے۔ لیکن اس لگاؤ میں وہ پہلے سی گرمی اب نہیں رہی۔ اس سرد مہری کی بنیادی وجہ کچھ درجہ ذیل ہیں مثلاً۔ 1۔ ہندوستانی فلموں، ڈراموں کی اور گانوں کی یلغار بلاشبہ ہندوستان کی فلم انڈسٹری دنیا کی موثر ترین فلم انڈسٹری ہے۔ کشمیر کے موضوع پر ہندوستان مختلف فلمیں بنا کر رائے عماہ پر اثر انداز ہونے میں کافی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس کے علاوہ فحش گانے اور لچر موسیقی ویسے بھی انسان سے دینی غیرت ختم کر دیتی ہے۔ ان ساری چیزوں کا اثر بھی عام لوگوں میں دیکھنے میں ملتا ہے۔ 2۔ آزاد کشمیر کے تعلیمی اداروں میں مسئلہ کشمیر کی خصوصی اہمیے اور توجہ کا ختم ہونا۔ جدید تعلیم کی دوڑ میں، کشمیر کی تاریخی اقدار، اہم مناسبتیں اور نصاب تعلیم میں کشمیریات کا محتویٰ کافی حد تک سکڑ گیا ہے۔ آزاد کشمیر کے نصاب تعلیم کو مکمل طور پر تحریک آزاد کشمیر سے ہم آہنگ رکھنے کی ضرورت ہے۔ 3۔ کشمیر میں جہاں کیمپوں سے مقامی عوام کا متنفر ہونا۔ تیسرے مسلے نے شدت کے ساتھ تحریک آزادی کی ساکھ کو متاثر کیا۔ اس سلسلے میں ایک مسئلے نے شدت کے ساتھ تحریک آزادی کی ساکھ کو متاثر کیا۔ اس سلسلے میں ایک تو مقبوضہ کشمیر میں بعض شدت پسند ٹولوں نے اپنی آزاد عدالتیں لگا کر مقامی لوگوں کو

ہندوستان کے لیے مخبری کے جرم کے شبے میں موت کے گھاٹ اُتارا جس سے لوگوں میں جہادی کیمپوں کے خلاف شدید نفرت کی لہر پیدا ہوئی اور ہندوستانی حکومت نے اس کو کیش کیا۔ اس طرح آزاد کشمیر میں متعدد جگھوں پر جہادی کہلانے والوں نے پولیس کی پٹائی کی۔ بعض مقامات پر لوگوں کو اغوا کیا اور کچھ مقامی بااثر شخصیات حتیٰ کہ MNA وغیرہ کو بھی مارا پیٹا گیا۔ یہ ہیں وہ حقائق جو ارباب دانش سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لہذا ابھی بھی ضرورت ہے کہ آزاد کشمیر میں جہادی سرگرمیوں کو مقامی افراد کے تعاون سے فروغ دیا جائے 4۔ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت۔ پاکستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ قتل وغارت نے بھی اہل کشمیر پر اثرات مرتب کیے ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کشمیر میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان منقسم ہے۔ جب لوگ پاکستان میں ٹارگٹ کلنگ، خود کش دھماکوں اور قتل وغارت کے واقعات سنتے اور دیکھتے ہیں تو وہ قطعاً یہ نہیں چاہتے کہ ہم اتنی قربانیاں دینے کے بعد ہندوستان کے کھشتریوں کی غلامی سے نکل کر پاکستان کی تکفیریوں کے غلام بن جائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان اس لیے قربانی دیتا ہے کہ تاکہ اس کے ہم فکر ہم عقیدہ اور ہم وطن محفوظ رہیں۔ کوئی بھی شخص اس لیے اپنی جان نہیں قربان کرتا کہ اس کے بعد اس کے بچوں کو سکولوں میں گولیاں مار دی جائیں اور اس کے عزیزوں کے گلے کاٹ دیئے جائیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شدت پسندوں نے پاکستان کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں بھی اپنا نیٹ ورک مضبوط کیا۔ کچھ سال پہلے تو آزاد کشمیر میں بھی صورت حال اتنی سنگین ہو گئی تھی کہ بعض شدت پسند حضرات پبلک ٹرانسپورٹ میں سوار ہو جاتے تھے اور ڈرائیور سے کہتے تھے کہ یہ کیسٹ لگاؤ۔ ان کیسٹوں میں مکمل فرقہ وارانہ تقریریں اور کافر کافر کے نعرے ہوتے تھے۔ بعد ازاں مظفر آباد کی امام بارگاہ خود دھماکے میں کئی لوگ شہید ہوئے۔ دھماکے کی تفصیلات کے مطابق ماتمی جلوس جب امام بارگاہ میں پہنچا تو خود کش حملہ آور جلوس میں شامل ہو گیا۔ تاہم جلوس میں جو رضاکار شامل تھے انہوں نے اسے پہچان لیا اور اُسے روکنے کی کوشش کی تو اُس نے اپنے آپ کو دھماکے سے اُڑا لیا جس سے انسانی اعضاء اور گوشت کے چھیتڑے دور دور تک بکھر گئے۔ اس طرح مظفر آباد میں ایک عالم دین کی ٹارگٹ کلنگ کا ہونا بھی یہ سب چیزیں باعث بنی ہیں کہ بیس کیمپ کے لوگ

اب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ پاکستان تو اس لیے بنایا گیا تھا کہ اس میں سارے مسلمان آزادی کے ساتھ زندگی گزاریں گے لیکن اب تو کسی کی زندگی محفوظ ہی نہیں ہے تحریک آزادی کشمیر کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کیلئے ضروری ہے کہ ہم مذکورہ بالا عوامل کا جائزہ لیں اور ایسی سرگرمیوں کو عوامی و سرکاری سطح پر مسترد کریں جو تحریک آزادی کشمیر پر منفی اثرات ڈالتی ہیں کشمیر میں شہید ہونے والے لاکھوں شہداکا خون ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم بیداری اور بصیرت کے ساتھ ان کے خون کا تحفظ کریں اور ان کی جدوجہد آزادی کو آگئے بڑھائیں

آرٹیکل 370 کا خاتمہ: کشمیر کا مسئلہ کیا ہے؟

پیر کو انڈیا کے وزیرِ داخلہ امت شاہ کی جانب سے انڈیا کے زیرِ انتظام کشمیر کو خصوصی حیثیت دینے والی آئین کی شق 370 کے خاتمے کے بعد یہ واضح ہو گیا ہے کہ گذشتہ چند دنوں سے حکومت کی جانب سے پیدا کیے گئے غیر معمولی حالات کسی ممکنہ ردِ عمل سے نمٹنے کے لیے کیے جا رہے تھے۔
اس سے قبل، انڈیا کے زیر انتظام کشمیر کے گورنر ستیہ پال ملک مسلسل یہ کہتے رہے کہ کشمیر میں 'سب کچھ نارمل ہے۔'
انڈیا بھر میں سیاسی پارٹیوں نے کشمیر کے حوالے سے سکیورٹی ایڈوائزری جاری کرنے پر حکومت سے وضاحت طلب کی تھی لیکن بی جے پی حکومت کے چند نمایاں افراد کے علاوہ کسی کو نہیں پتا تھا کہ کشمیری رہنماؤں عمر عبداللہ، محبوبہ مفتی اور سجاد لون کی نظربندیاں کیوں عمل میں آئیں، کشمیر میں دفعہ 144 کیوں نافذ کی گئی، اور یہاں تک کہ جموں میں کرفیو کا نفاذ کیا غیر معمولی عمل نہیں؟
تاہم آج کے اقدام سے انڈیا اور پاکستان کے درمیان گزشتہ 73 سالوں سے جاری کشمیر کے تنازعے کی نوعیت تبدیل ہونے کا امکان ہے۔

مسئلہ کشمیر: پاکستان اور انڈیا کے درمیان بڑا تنازعہ اقوام متحدہ میں کب اور کیسے زیر بحث رہا؟

انڈیا کے زیر انتظام کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم ہونے کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم عمران خان اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنے خطاب میں کشمیر کے مسئلے پر بات کریں گے۔ اس موقع پر ایک نظر ڈالتے ہیں کہ پاکستان اور انڈیا کے درمیان سب سے بڑا تنازعہ اقوام متحدہ میں کب اور کیسے زیر بحث رہا؟

سنہ 1972 سے پاکستان کو کشمیر کے تنازعے کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے کسی بھی فورم پر کسی بھی قرارداد کو ووٹنگ کے لیے پیش کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ پاکستان اس مسئلے پر صرف تقریروں پر اکتفا کرتا رہا ہے۔

پاکستان نے حال ہی میں اقوام متحدہ کی کونسل برائے انسانی حقوق کے اجلاس میں انڈیا کے زیرِ انتظام کشمیر میں انڈیا کے اقدامات کے خلاف مذمتی قرارداد ہی جمع نہیں کرائی۔

حالانکہ کونسل کے اجلاس کے آغاز سے پہلے ہی اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کی کمشنر میچل بیچیلیٹ نے انڈیا کے زیرِ انتظام کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر مذمتی بیان جاری کیا تھا۔ ان کے اس بیان کو انڈیا نے مسترد کر دیا تھا۔

مسئلہ کشمیر: کب کیا ہوا؟

گذشتہ 72 سالوں میں کشمیر میں کیا ہوا؟ مسئلہ کشمیر کی مکمل ٹائم لائن

14-15 اگست 1947: برطانیہ سے آزادی کے بعد دو خود مختار ریاستیں پاکستان اور بھارت وجود میں آئیں، ریاستوں اور راجواڑوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے عوام کی منشا کے مطابق کسی بھی ملک میں شامل ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہیں۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر اس کے ہندو راجہ نے وقت پر کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

اکتوبر 1947: کشمیر میں جاری داخلی خانہ جنگی میں پاکستان سے قبائلی لشکر بھی شامل ہو گئے۔

26 اکتوبر 1947: مہاراجہ نے بھارت سے مدد چاہتے ہوئے کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیئے تاہم یہ الحاق مشروط تھا کہ جیسے ہی حالات معمول پر آئیں گے کشمیر میں رائے شماری ہو گی۔

27 اکتوبر 1947: بھارت نے اپنی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتار دیں تاکہ کشمیر میں ہونے والی بغاوت کو کچلا جا سکے جس کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلی جنگ چھڑ گئی۔

یکم جنوری 1948: بھارت نے مسئلہ کشمیر پر اقوامِ متحدہ سے مدد مانگ لی۔

5 فروری 1948: اقوام متحدہ نے ایک قرارداد کے ذریعے فوری جنگ بندی کا مطالبہ کیا تاکہ وہاں رائے شماری کرائی جا سکے۔

یکم جنوری 1949: اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کراتے ہوئے دونوں ممالک کی فوجوں کو جنگ بندی لائن کا احترام کرنے کا پابند کیا اور وہاں رائے شماری کرانے کا اعلان کیا۔

26 جنوری 1950: بھارتی آئین میں آرٹیکل 370 کا اضافہ جس میں ریاست جموں و کشمیر کو دفاع، خارجہ اور مواصلات کے علاوہ خود مختار حیثیت دی گئی۔

اکتوبر1950: شیخ عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس نے جموں وکشمیر میں انتخابات کا مطالبہ کیا تاکہ ریاستی اسمبلی کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرے۔

30مارچ1951: اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے کشمیر میں انتخابی عمل کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ یہ اسمبلی رائے شماری کا متبادل نہیں ہے اور نہ ہی کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کر سکتی ہے ساتھ ہی ایک نمائندہ مقرر کرنے اور کشمیر کو غیر فوجی علاقہ قرار دینے کا اعلان کیا مگر اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

ستمبر 1951: کشمیر کی اسمبلی کے انتخابات میں نیشنل کانفرنس نے تمام 75 نشستیں بلا مقابلہ حاصل کر لیں۔

31اکتوبر 1951: شیخ عبداللہ نے ریاستی اسمبلی میں اپنی پہلی تقریر میں ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کے حق میں دلائل دیئے۔

جولائی1952: شیخ عبدااللہ نے دہلی معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے تحت انڈیا کے زیر انتظام ریاست کو داخلی خود مختاری دی جائے گی۔

جولائی 1953: سائما پرشاد مکرجی نے 1952 سے کشمیر کے بھارت سے مکمل الحاق کے بارے میں جو تحریک شروع کر رکھی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ عبداللہ نے کشمیر کی خود مختاری کی تجویز دے دی۔

8اگست 1953: شیخ عبداالاللہ کو بطور وزیر اعظم فارغ کرتے ہوئے گرفتار کرکے بھارت میں قید کر دیا گیا اور ان کی جگہ بخشی غلام محمد کو وزیر اعظم بنا کر مظاہرین کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کا ٹاسک سونپا گیا۔

17-20اگست 1953: بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم کے درمیان دہلی میں ملاقات ہوئی جس میں اپریل1954 کے آخر تک وہ کشمیر میں رائے شماری کے لیے ایڈمنسٹریٹر تعینات کرنے پر متفق ہو گئے ۔تاہم جیسے ہی پاکستان اور امریکہ کے درمیان سٹریٹجک تعلقات گہرے ہوئے تو بھارت نے اس مسئلے کو بھی سرد جنگ کا حصہ قرار دیتے ہوئے رائے شماری سے انکار کر دیا۔

فروری 1954: کشمیر کی اسمبلی نے بھارت کے ساتھ الحاق کر دیا۔

14 مئی 1954: آئینی حکم نامہ 1954 جس کا تعلق ریاست جموں و کشمیر سے تھا اسے لاگو کر دیا گیا جو دہلی معاہدے کو منسوخ کرتے ہوئے ریاست کو بھارتی عمل داری میں دیتے ہوئے تمام شہری آزادیوں کو ختم کرتا تھا۔

14 جنوری 1957: اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک بار پھر 1951 کی قرارداد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی اسمبلی کسی طور بھی کشمیر کے مستقبل کے بارے میں فیصلے کا اختیار نہیں رکھتی اور نہ ہی یہ رائے شماری کا متبادل ہے۔

26 جنوری 1957: ریاستی اسمبلی نے جموں و کشمیر کا آئین نافذ کیا جس کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو بھارتی یونین کا حصہ قرار دیا گیا تھا۔

9 اگست 1955: رائے شماری محاذ قائم کیا گیا جس نے شیخ عبداللہ کی رہائی اور اقوامِ متحدہ کی زیر نگرانی کشمیر میں رائے شماری کا مطالبہ کیا۔

20 اکتوبر تا 20 نومبر 1962: لداخ میں بھارت اور چین کے مابین ایک سرحدی تنازعے نے جنگ کی شکل اختیار کر لی جس کے نتیجے میں لداخ کے ایک بڑے علاقے پر چین قابض ہو گیا۔

13 ستمبر 1965 کو لی گئی اس تصویر میں پاکستان اور بھارت کے دوران دوسری جنگ میں بھارتی فوجی حاجی پیر کے علاقے میں تعینات (اے ایف پی)

مارچ1965: بھارتی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا جس کے تحت کشمیر کو بھارت کو صوبہ قرار دیتے ہوئے بھارت کو وہاں گورنر تعینات کرنے، کشمیر میں حکومت کو برطرف کرنے اور اسے آئین سازی سے روکنے کے اختیار حاصل ہو گئے۔

23اگست تا ستمبر1965: پاکستان اور بھارت کے درمیان دوسری جنگ چھڑ گئی جس نے 1949 کے فائر بندی معاہدے کو ختم کر دیا۔

10 جنوری1966: بھارت اور پاکستان کے مابین تاشقند معاہدے پر دستخط ہو گئے جس کے تحت دونوں ممالک اپنی اپنی افواج کو جنگ سے پہلے والی پوزیشنوں پر لانے میں متفق ہو گئے۔

3-16 دسمبر1971: پاکستان اور بھارت میں جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔

فروری1972: محاذ برائے رائے شماری پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ ریاستی اسمبلی کے انتخابات نہیں لڑ سکتا۔

2جولائی 1972: پاکستان اور بھارت کے درمیان شملہ معاہدہ ہوا جس میں اقوامِ متحدہ کی فائر بندی لائن کو لائن آف کنٹرول قرار دیا گیا مزید یہ کہ اس معاہدے کی رو سے فریقین اس مسئلے کو دوطرفہ مذاکرات سے حل کریں گے۔

13نومبر1974: شیخ عبداللہ کو رہا کر کے اسے بطور وزیر اعلیٰ بحال کر دیا گیا۔ جبکہ اس کے نائب وزیر اعلیٰ نے بھارت کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے تحت ریاست جموں و کشمیر بھارت کا آئینی حصہ ہو گا اس طرح وہ1953 میں اپنے خود مختاری کے دعوے سے پھر گئے۔

23مئی1977: شیخ عبداللہ نے دھمکی دی کہ بھارت کے ساتھ الحاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک بھارت آرٹیکل370 کے تحت کشمیر کو داخلی خود مختاری نہیں دیتا۔

8ستمبر1982: شیخ عبداللہ انتقال کر گئے جس کے بعد ان کے بیٹے فاروق عبداللہ نے قیادت سنبھال لی۔

اپریل1984: بھارت نے سیاچین گلیشئر پر قبضہ کر لیا۔

جون 1984: بھارت کے تعینات کردہ گورنر اور ہندو قوم پرست رہنما جگموہن نے فاروق عبداللہ کو معطل کر کے نیشنل کانفرنس کے غلام محمد شاہ کو وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا جس سے کشمیر میں مظاہرے پھوٹ پڑے جس پر غلام محمد شاہ نے کشمیر میں کرفیو نافذ کر دیا۔

7مارچ1986: جگموہن نے غلام محمد شاہ کو وزارتِ اعلیٰ سے برخاست کرتے ہوئے خود اختیارات سنبھال لیے اور مسلمانوں کی سرکاری نوکریوں پر پابندی لگادی۔

23 مارچ 1987: مسلم یونائیٹڈ فرنٹ جو کہ ایک مقبول جماعت تھی اس نے انتخابات میں حصہ لیا مگر کانگریس اور مسلم کانفرنس کا اتحاد جیت گیا جس پر دھاندلی کے الزامات لگے اور فاروق عبداللہ کی غیر مقبول حکومت کے خلاف مظاہرے پھوٹ پڑے۔

1989: بھارتی حکمرانی کے خلاف مسلح تحریک شروع ہو گئی جس کی قیادت مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے ممبران کر رہے تھے سال کے ایک تہائی دنوں میں ہڑتالیں رہیں ریاستی اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا گیااور ٹرن آؤٹ صرف پانچ فیصد رہا۔

1990: بغاوت جاری رہی۔ پاکستان سے بڑی تعداد میں مجاہدین وادی میں داخل ہو گئے۔

20 جنوری 1990: جگموہن سنگھ کو گورنر تعینات کرنے کے اگلے روز بھارتی پیراملٹری ریزرو پولیس فورس نے گوکدل میں نہتے مظاہرین جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے ان پر گولی چلا دی اس قتل عام کے خلاف پورے کشمیر میں پر تشدد مظاہرے پھوٹ پڑے۔

یکم مارچ1990: سری نگر میں اقوام متحدہ کے ملٹری آبزرور گروپ کے دفتر کے سامنے پانچ لاکھ سے زائد کشمیریوں نے مارچ کیا جنھوں نے کشمیر میں اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق رائے شماری کا مطالبہ کیا۔ جس پر بھارتی فوج نے مظاہرین پر دو مقامات پر فائرنگ کر دی۔ ذکورا کراسنگ میں 26 اور تنگ پورہ

بائی پاس پر 21 شہری مارے گئے۔ جس پر کشمیر میں 162،500 ہندو کمیونٹی کو نکال کر جموں میں پناہ گزین کیمپوں میں منتقل کیا گیا۔

30 مارچ 1990: جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے رہنما اشفاق وانی کے جنازے میں بہت بڑا اجتماع ہوا۔

6 جنوری 1993: بھارتی بارڈر سیکورٹی پولیس نے عسکریت پسندوں کے ایک حملے کا بدلہ لینے کے لیے سوپور میں 55 شہریوں کو ہلاک کر دیا۔

22 اکتوبر 1993 کی اس تصویر میں ایک کشمیری خاندان بھارتی فوجیوں کی فائرنگ میں ہلاک ہونے والے اپنے رشتہ دار کے جنازے پر رو رہے ہیں (اے ایف پی)

مارچ 1993: سیاسی، سماجی اور مذہبی گروپوں پر مشتمل آل پارٹیز حریت کانفرنس نے حق خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔

1998: پاکستان اور بھارت دونوں کی جانب سے جوہری ہتھیاروں کے تجربات

21 فروری 1999: بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اور پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف نے اعلان لاہور پر دستخط کئے جس کے تحت کشمیر سمیت تمام تصفیہ طلب مسائل کو باہمی مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کا اعادہ کیا گیا۔

مئی-جولائی 1999: پاکستان و بھارت کے درمیان کارگل جنگ چھڑ گئی۔

2000: ایک دہائی سے جاری کشمیر میں عسکری تحریک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی جس میں پر امن اور غیر متشدد طریقے اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔ کشمیر کے مسئلے پر بھی اعتماد کی بحالی کے لیے اقدامات کئے گئے اگرچہ ان میں تعطل آتا رہا اور دونوں ممالک کشمیر میں کسی تصفیہ پر متفق نہیں ہو سکے۔

11 مارچ 2001: اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے دونوں ممالک کو اعلانِ لاہور کے تحت آگے بڑھنے کا مشورہ دیا جس پر جولائی 2001 میں مشرف اور واجپائی کے درمیان آگرہ میں ملاقات ہوئی مگر کوئی اعلان جاری نہ ہو سکا۔
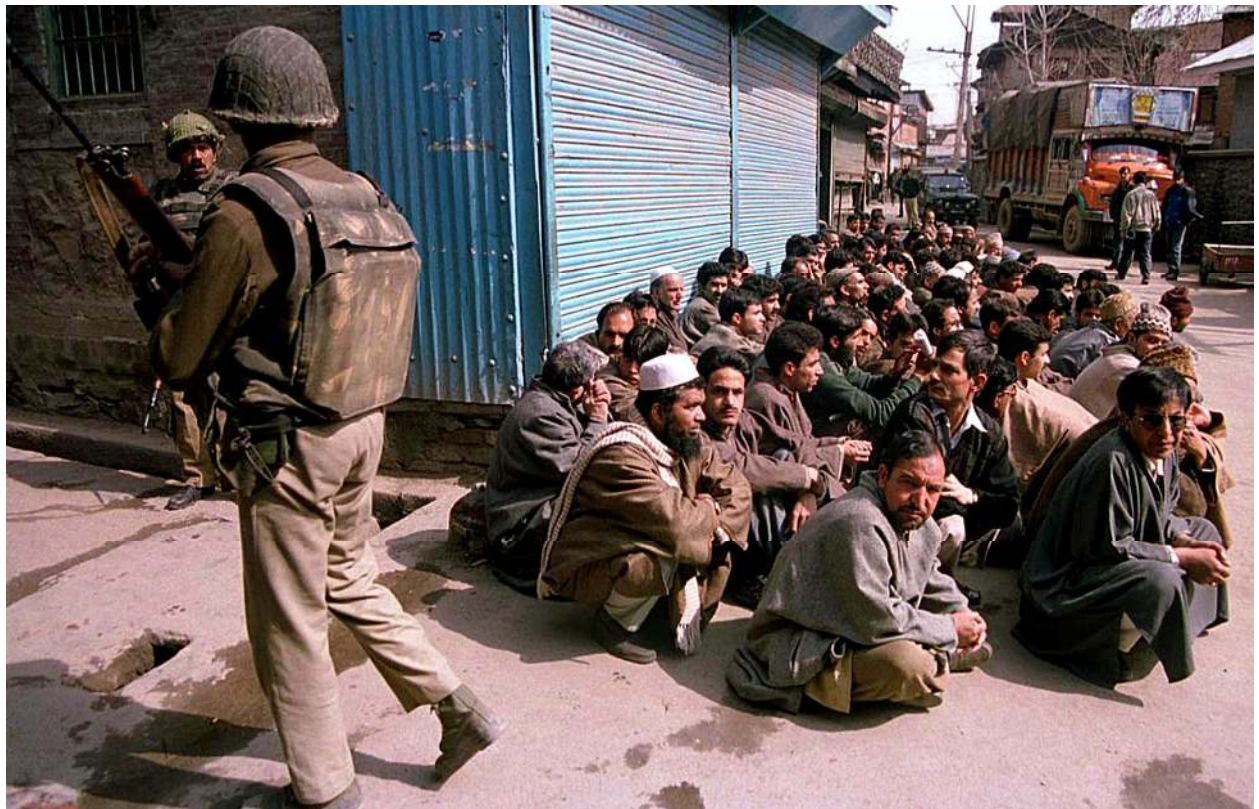
22مارچ 2001 میں لی گئی اس تصویر میں بھارتی باڈر سکیورٹی فورس اہلکار سری نگر میں ایک آپریشن کے دوران حراست میں لیے گئے کشمیریوں کے ساتھ (اے ایف پی)

اکتوبر 2001: کشمیر اسمبلی سری نگر پر حملے کے نتیجے میں 38 افراد ہلاک۔

دسمبر 2001: بھارتی پارلیمنٹ پر نئی دہلی میں حملہ، لشکر طیبہ اور جیش محمد نے ذمہ داری قبول کی۔

2004-2007: مسئلہ کشمیر پر بیک چینل روابط کے ذریعے دونوں ممالک نے کشمیری قیادت کے ساتھ مزاکرات کئے

اپریل 2005: مظفر آباد سری نگر بس سروس شروع ہوئی۔

مئی 2008: بھارتی حکومت اور جموں و کشمیر کی حکومت کی جانب سے ہندو شری امر ناتھ شرائن بورڈ کو زمین منتقل کرنے کے فیصلے کے خلاف کشمیر بھر میں مظاہرے شروع ہو گئے جو کہ 1990 کے بعد سب سے بڑے مظاہرے تھے مسلح پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کی اور کشمیر اور بھارت کو ملانے والی سڑک بلاک ہو کر رہ گئی۔

24 مئی 2008 کو سری نگر میں ایک مظاہرہ (اے ایف پی)

21 فروری 2009: بومائی میں بھارتی فوج نے دو عبادت گزاروں کو جان بوجھ کر گولی مار دی جس پر بومائی اور ملحقہ علاقوں میں مظاہرے شروع ہو گئے جس پر کرفیو لگانا پڑا۔

29-30 مئی 2009: دو خواتین 22 سالہ نیلو فرجان اور 17 سالہ عائشہ جان کو شوپیاں میں اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔

جون 2009: کشمیر بھر میں مظاہرے شروع ہو گئے جنہوں نے سینٹرل پولیس ریزرو فورس کو زیادتی اور قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا جس پر شوپیاں میں کرفیو لگا دیا گیا۔

30 اپریل 2010: ماشیل سیکٹر میں بھارتی فوج نے تین عسریت پسندوں کو لائن آف کنٹرول کراس کرنے کے الزام میں موت کے گھاٹ اتار دیا بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ مقابلہ فرضی تھا اور مرنے والے تینوں عام کشمیری تھے اور انہیں صرف اس لیے مارا گیا کہ ان کے قتل کے عوض وہ کیش انعام حاصل کر سکیں۔

11جون2010: 17 سالہ طفیل احمد مٹو جو سکول سے گھر آ رہا تھا اس وقت ہلاک ہو گیا جب آنسو گیس کا ایک شیل اس کے قریب آ کر سر پر مارا گیا۔اس کے نتیجے میں بھی مظاہرے پھوٹ پڑے جس سے نمٹنے کے کئے کرفیو لگا کر سینکڑوں کشمیریوں کو ہلاک کر دیا گیا۔

اگست 2011: وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ نے ان 1200 نوجوانوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جو کہ گزشتہ سال حکومت کے خلاف مظاہروں میں سیکورٹی فورسز پر پتھر پھینکنے میں ملوث تھے۔بھارت کے ریاستی ہیومن رائٹس کمیشن نے لائن آف کنٹرول کے قریب ایسی اجتماعی قبروں کی نشاندہی کی جہاں2000 کے قریب نامعلوم لوگ دفنائے گئے تھے خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں وہ کارکن بھی شامل تھے جنہیں بھارتی فوجوں نے گرفتار کر رکھا تھا یا جنہیں غائب کر دیا گیا تھا۔1989 سے اب تک ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مارے جا چکے تھے۔

فروری 2013: کشمیری جیش محمد کے کارکن محمد افضل گرو جن پر 2001 میں بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کا الزام تھا انہیں پھانسی دیئے جانے کے خلاف وادی میں مظاہرے ہوئے جن کے نتیجے میں دو افراد ہلاک کر دیئے گئے۔

ستمبر 2013: پاکستان و بھارتی وزرائے اعظم کی ملاقات میں لائن آف کنٹرول کے آر پار تشدد کو کم کرنے پر اتفاق

اگست 2014: بھارت نے یہ کہہ کر پاکستان سے مذاکرات ختم کر دیئے کہ نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر نے کشمیری علیحدگی پسندوں کے ساتھ مذاکرت کئے تھے۔

اکتوبر 2014: پاکستان اور بھارت میں سرحدوں پر کشیدگی، دونوں طرف 18 ہلاکتوں کی تصدیق۔

8اکتوبر2014 کی اس تصویر میں خواتین باڈر کے پار سے گولہ باری میں اپنے گھر کو ہونے والے نقصان پر پریشان دکھائی دے رہی ہیں (اے ایف پی)

مارچ2015: تاریخ میں پہلی بار بی جے پی نے کشمیر میں مقامی جماعت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت بنائی اور مفتی محمد سعید کو وزیر اعلیٰ چنا گیا۔

ستمبر2015: کشمیر میں مسلمانوں نے بڑے گوشت پر پابندی کے خلاف اپنی دوکانیں اور تجارتی مراکز بند کئے۔

اپریل2016: محبوبہ مفتی اپنے باپ مفتی سعید کے بعد کشمیر کی پہلی خاتون وزیر اعلیٰ بنیں۔

جولائی2016: حزب المجاہدین کے سر کردہ کمانڈر برہان وانی کی شہادت کے بعد ہونے والے مظاہروں کے نتیجے میں کشمیر میں کرفیو لگا دیا گیا۔

اگست 2016: وادی میں جاری 50 روزہ کرفیو میں نرمی کی گئی۔ برہان وانی کی ہلاکت کے بعد وادی میں مظاہروں اور تشدد کی لہر کے نتیجے میں 68 شہری ہلاک اور 9000 لوگ زخمی ہوئے۔

ستمبر 2016: کشمیر میں ایک فوجی بیس پر حملے کے نتیجے میں 18 بھارتی فوجیوں کی ہلاکت کے بعد پاکستان اور بھارت میں دھمکیوں کا تبادلہ۔

نومبر 2016: لائن آف کنٹرول پر جھڑپ میں سات پاکستانی فوجیوں کی شہادت کے بعد آزاد کشمیر میں ایل او سی پر بڑی تعداد میں لوگوں کو محفوظ ماامات پر منتقل کیا گیا۔

مئی 2017: حریت کمانڈر سبزار احمد بھٹ کی نماز جنازہ میں شمولیت کے لیے ہزاروں لوگوں نے کرفیو کو توڑ ڈالا۔

جولائی 2017: ہندو یاتریوں پر حملے کے نتیجے میں سات افراد ہلاک ہو گئے۔

14 فروری 2019: پلوامامیں ایک خودکش حملے کے نتیجے میں 40 بھارتی فوجی ہلاک ہو گئے۔

21 فروری 2019: بھارت نے پاکستان کا پانی بند کرنے کی دھمکی دی۔

26 فروری 2019: بھارت نے بالا کوٹ میں مجاہدین کے ایک کیمپ پر فضائی حملہ کیا اور کئی مجاہدین کو مارنے کا دعویٰ کیا۔

27 فروری 2019: پاکستان نے بھارت کے دو طیاروں کو مار گرایا اور ایک بھارتی پائلٹ کو گرفتار کر لیا۔

5 اگست 2019: بھارتی حکومت نے آئین میں سے آرٹیکل 370 کو ختم کر دیا جو کہ کشمیر کو خصوصی حیثیت دیتا تھا۔ اس طرح کشمیر کو بھارتی یونین میں ضم کر دیا گیا۔

8 اگست 2019 کی اس تصویر میں بھارتی فوجی کرفیو کے دوران باہر نکلنے والے کشمیری شہریوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں (اے ایف پی)

16 اگست 2019: 1965 کے بعد پہلی بار کشمیر کے مسئلے پر اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا۔

'کشمیریوں کا عدم اتحاد کشمیر کاز کی ناکامی کی وجہ بن رہا ہے'

اسلام آباد کی طرف سے کشمیر کے دیرینہ تنازعے کی طرف عالمی برادری کی توجہ مبذول کروانے کی کوششوں میں غیر معمولی تیزی آئی ہے۔ مسئلہ کشمیر کا حل تاہم مستقبل قریب میں نکلتا نظر نہیں آرہا۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

بھارت کی طرف سے جموں وکشمیر کی خود مختار حیثیت کے خاتمے کے اعلان کے ایک سال مکمل ہونے پر اسلام آباد کی طرف سے کشمیر کے دیرینہ تنازعے کی طرف عالمی برادری کی توجہ مبذول کروانے کی کوششوں میں غیر معمولی تیزی آئی ہے۔ مسئلہ کشمیر کا حل تاہم مستقبل قریب میں نکلتا نظر نہیں آرہا۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟ موجودہ صورتحال پر ڈی ڈبلیو نے یورپ میں کشمیریوں کے حقوق کے لیے سرگرم اہم شخصیات کے ساتھ بات چیت کی۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بُدھ کے روز پاکستان کی درخواست پر کشمیر کے تنازعہ پر بحث کی۔ بھارت کی ہندو قوم پرست حکومت کی جانب سے ایک برس قبل جموں وکشمیر کے مسلم اکثریتی خطے کی نیم خودمختاری کی حامل خصوصی حیثیت کو ختم کرنے کے اعلان کے بعد سے اب تک سلامتی کونسل نے تیسری بار کشمیر کے تنازعے کو زیر بحث لایا ہے تاہم اقوام متحدہ کی اس طاقتور باڈی کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کوئی ٹھوس قدم سامنے نہیں آیا ہے اور نہ ہی بند دروازوں کے پیچھے ہونے والی اس ورچوئل میٹنگ کے بعد کوئی بیان جاری کیا گیا ہے۔

کشمیریوں کے حقوق کے لیے پشاور میں ہونے والا احتجاجی مظاہرہ۔

یورپ میں آباد کشمیری برادری اس وقت بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں شہریوں پر ہونے والے مظالم اور ان کے بنیادی حقوق کی پامالی پر بہت پژمردہ ہے۔ 'کشمیر کونسل ای یو' برسلز میں قائم ایک غیر سیاسی تنظیم ہے جس کا مقصد یورپی سطح پر جموں و کشمیر کی صورتحال اور بھارت کے زیر انتظام کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ان شہریوں کو ان کے بنیادی انسانی اور جمہوری حقوق سے محروم رکھے جانے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات عام کرنا ہے۔ اس کونسل کا مشن جموں و کشمیر کی مسلم آبادی کے انسانی حقوق کی پامالی ختم کروانا اور مغربی طاقتوں کی توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کروانا ہے۔

کشمیر کونسل ای یو کی روح رواں علی رضا سید نے یورپی سطح پر مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ ڈوئچے ویلے کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے علی رضا سید نے کہا کہ مسئلہ کشمیر کا حل صرف اور صرف کشمیری عوام کی اپنی کوششوں سے نکل سکتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا پاکستان کی طرف سے تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے کی جانے والی سیاسی اور سفارتی کوششیں کا کوئی مثبت نتیجہ نظر آ رہا ہے؟ اُن کا کہنا تھا، "گزشتہ ایک سال کے دوران کشمیری عوام کے مصائب و آلام میں تو کوئی کمی نہیں آئی۔ جتنی بھی کوششیں کی جاچکی ہیں اُن کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ اب تک عالمی برادری کو ہم اس بات کے لیے قائل نہیں کر پائے ہیں کہ کشمیریوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کا خاتمہ ہونا چاہیے۔"

علی رضا سید کا کہنا ہے کہ بحیثیت ایک کشمیری انہیں سب سے زیادہ ملال اس بات کا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ہونے والی کوششوں کے اثرات جموں و کشمیر میں ظلم و زیادتی کے شکار کشمیری عوام تک نہیں پہنچ رہے۔ جب ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان دونوں کی طرف سے محض ایک سیاسی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال ہو رہا ہے؟ تو ان کا جواب تھا، "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مسئلہ کشمیر پر سیاست ہو رہی ہے۔ اصل فریق تو خود کشمیری ہیں جب تک اُن کی نہیں سنی جائے گی تب تک مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ 15 ملین کشمیریوں کا ہے، ایک انسانی مسئلہ ہے، یہ کوئی بارڈر کا جھگڑا نہیں ہے۔ کشمیری ہی خود اپنی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ کوئی دوسرا ان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

برسلز میں مودی کے خلاف کشمیریوں کا مظاہرہ۔

کشمیری عوام اپنی آزادی اور بنیادی حقوق کے حصول میں اب تک کیوں ناکام رہے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کشمیر کونسل ای یو کے صدر علی رضا سید کہتے ہیں، "اس کے قصوروار خود کشمیری ہیں۔ کشمیری عوام متحد نہیں ہیں۔ کشمیریوں کی متعدد تنظیمیں ہیں۔ کشمیری چاہے پاکستان کے زیر انتظام کشمیر سے ہوں یا بھارت کے زیر انتظام کشمیر سے ان میں اتحاد نہیں پایا جاتا۔ جب تک اتحاد کا فقدان ہے تب تک ان کی آواز کسی سطح پر بھی نہیں سنی جائے گی۔"

علی رضا سید کا کہنا ہے کہ کشمیر کے بحران کے حل کی اولین ذمہ داری خود کشمیریوں پر عائد ہوتی ہے۔ کشمیریوں کی ایک آواز ہونی چاہیے جو اپنے حق خود مختاری کے لیے وہ خود بلند کریں۔ تحریک کشمیر کی

قیادت خود کشمیریوں کو کرنا ہو گی۔ یورپی پارلیمان میں کشمیریوں کے موقف کو سنجیدگی سے نہیں لیا جا رہا کیونکہ کشمیریوں کا کوئی ایک متحدہ مقصد و موقف نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے مزید کہا، "مغربی طاقتیں ہماری بات کو تب ہی سچ سمجھیں گی، جب کشمیری متحد ہو کر اپنی آزادی اور اپنے حقوق کے لیے خود اپنی بات ان تک پہنچائیں گے۔ ہم کشمیری اپنے مصائب اور مسائل کی حقیقت کے بارے میں مغربی طاقتوں کو سمجھانے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم اس کا ذمہ دار کسی اور کو نہیں ٹھہرا سکتے۔"

کشمیر کونسل ای یو کے صدر علی رضا سید نے تاہم امید ظاہر کی ہے کہ کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ان کے مسائل کو یورپ اور دیگر خطوں میں بسنے والے کشمیری بھی محسوس کریں گے اور اس کے خلاف تمام کشمیری متحد ہو کر اپنی آواز بلند کریں گے۔

مظفر آباد میں کشمیری قوم پرستوں کا مظاہرہ۔

اُدھر برطانیہ میں سرگرم تحریک کشمیر کے ساؤتھ زون کے سابق جنرل سکریٹری ڈاکٹر اسامہ ایوب نے ڈوئچے ویلے کے ساتھ پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کے تناظر میں کیے جانے والے حالیہ اقدامات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے پاکستان کا نیا نقشہ پیش کر کے کشمیر کو پاکستان کا حصہ ثابت کرنے کی کوشش جیسے اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسامہ ایوب نے کہا، "بھارت اور پاکستان دونوں کشمیر کو کسی صورت اپنا حصہ ثابت کرنے کے لیے کبھی کسی نقشے کا سہارا لیتے ہیں کبھی کچھ اور کیا جاتا ہے۔ یہ امر دراصل اصولی طور پر غلط ہے کہ دونوں ممالک خود ہی کشمیر کو اپنے

ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چاہے پاکستان بھارت کے زیر انتظام کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے یا بھارت پاکستانی کشمیر پر اپنا دعویٰ کرے یہ صریحاً غلط ہے۔ اس میں کشمیریوں کی رائے کہاں ہے؟ کشمیریوں کو ان کا حق رائے دہی ملنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی کشمیر کو کسی نقشے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر اسامہ ایوب نے کہا کہ کشمیریوں کی رائے کا کوئی احترام نہیں کیا جا رہا۔ اس وقت سیاسی اور سفارتی رسہ کشی جاری ہے دونوں طرف سے کشمیریوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کشمیری بھارت اور پاکستان دونوں کے زیر انتظام حصے میں موجود ہیں۔ ان دونوں کی رائے کا احترام کیا جانا چاہیے۔ انہیں اقوام متحدہ کی قرارداد کے تحت ان کے بنیادی حقوق اور حق رائے دہی ملنا چاہیے۔ انہوں نے کہا، " برائے مہربانی ہمیں دونوں طرف سے کھینچا تانی کی سیاست کا شکار نا بنائیں۔"

کشور مصطفیٰ / عاطف توقیر

مسئلہ کشمیر کی اصل کہانی

کہتے ہیں کہ کشمیر تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا ہے۔اب دیکھتے ہیں کہ تقسیم ہند کا ایجنڈا کیا ہے؟اس کا پس منظر کیا ہے؟اور پیش منظر کیا ہونا چاہئے!

اس بات کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ کشمیر میں پہلے کس کی حکومت تھی؟اس کا پرچم کیسا تھا؟ظاہر ہے تقسیم ہند سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ اس کا حکمران تھا۔کشمیر کا جھنڈا کچھ یوں ہے کہ اس میں چار سفید دھاریاں ہیں جو کہ چار دریائوں کو ظاہر کرتی ہیں۔(1)سندھ (2)جہلم (3)چناب (4)دارس۔اسی طرح پرچم کے گرین حصے بھی چار ہیں اور وہ کشمیر کے چار علاقوں کو ظاہر کرتے ہیں۔(1)جموں (2)کشمیر (3) لداخ (4)گلگت بلتستان۔برصغیر کا ہندوستان، تقسیم کے بعد اب بھارت کہلاتا ہے۔-3جون 1947ء کو تقسیم ہند کا فیصلہ ہوا۔اس فیصلے کے مطابق برٹش انڈیا (برطانوی انڈیا) جس میں پنجاب۔بنگال۔آسام۔یو پی۔سی پی وغیرہ تھے،ان کو تقسیم کیا جانا تھا۔دوسرا حصہ دیسی ریاستوں یعنی (انڈین۔انڈیا) جن کا الحاق برطانوی حکومت کے ساتھ تھا۔جن میں بہاولپور، قلات، سوات، جوناگڑھ، حیدرآباد دکن، جموں وکشمیر وغیرہ یہ چھوٹی بڑی 565ریاستیں تھیں جو کہ آزاد تھیں اور ان کا برطانوی حکومت کے ساتھ الحاق تھا۔

1946ء کے انتخابات میں جن علاقوں میں (مسلم لیگ) اس وقت ''آل انڈیا مسلم لیگ'' نہیں تھی بلکہ ''آل انڈیا مسلم کانفرنس'' تھی نے زیادہ سیٹیں حاصل کی تھیں،ان کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا تھا اور جن علاقوں میں ہندوئوں نے زیادہ سیٹیں لی تھیں ان کو ہندوستان میں رہنا تھا۔یہ فیصلہ برطانوی ہند کے علاقوں سے متعلق تھا۔

-3جون 1947ء کو برٹش انڈیا کی تقسیم کا فیصلہ ہوا۔اس فیصلے میں 1946ء کے انتخابات کا عمل دخل تھا۔محض زیادہ سیٹیں لینے والے علاقے (1946ء کے انتخاب میں) کے بارے یہ فیصلہ تھا۔باقی 565ریاستیں چھوٹی بڑی، وہ تو پہلے ہی آزاد تھیں۔ان کے حکمران کو اختیار دیا گیا، جس ریاست کے ساتھ الحاق کرنا چاہیں کرلیں۔خواہ پاکستان ہو، خواہ ہندوستان۔ان کو ایک تیسری آپشن بھی دی گئی کہ اگر وہ کسی سے بھی الحاق نہ کرنا چاہیں تو وہ بطور آزاد ریاست کے رہ سکتی ہیں۔کیونکہ برطانوی حکومت تو ''ہندوستان'' چھوڑ کر

جا رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے جو بھی فیصلہ کرنا چاہیں کریں۔ یاد رہے! یہ اختیار ان ریاستوں کے حکمرانوں کو دیا گیا تھا۔ عوام کی مرضی اس میں شامل نہ تھی۔ اسی وجہ سے حیدر آباد ریاست کے نظام میر عثمان علی خان نے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ وہاں اکثریت ہندوئوں کی تھی رقبے اور معیشت کے لحاظ سے کئی ملکوں سے بڑی تھی پاکستان میں اس کے سفیر کا نام مشتاق محمد تھا۔

اس طرح ریاست جونا گڑھ بڑی ریاست تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے والد شاہ نواز بھٹو تقسیم سے پہلے اس ریاست کے وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ انہوں نے پاکستان سے الحاق کیا۔ یہ دو ریاستیں ایسی تھیں جن کا فیصلہ تو حکمرانوں نے کیا لیکن دونوں پر بعد میں ہندوستان نے قبضہ کر لیا۔ اگر دیکھا جائے تو علامہ اقبالؒ کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد میں کشمیر کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ یہ تو ایک آزاد ریاست تھی۔ ان کا ایک معاہدہ تھا جسے (STAND STILL ACREEMENT) کہتے ہیں۔ اس کا حکمران راجہ ہری سنگھ تھا۔ اسی طرح کا معاہدہ 565 دیسی ریاستوں کا (برطانوی حکومت کے ساتھ تھا)

برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان علاقوں پر بالخصوص جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے برطانوی حکومت کے زیر نگیں تھے۔ انکے علاوہ 565 چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں۔ ان میں بعض ریاستوں کے حکمران مسلمان تھے جیسے حیدر آباد دکن اور بعض ریاستوں کے حکمران (جنہیں راجہ، مہاراجہ، والی خان وغیرہ) کے نام سے جانا جاتا تھا، مسلم / غیر مسلم یا سکھ تھے۔ اس طرح بھوپال کی مسلم ریاست تھی، خان آف قلات، قلات کا حکمران تھا۔ والیٔ سوات، سوات کا حکمران تھا وغیرہ وغیرہ یہ سب ریاستیں آزاد تھیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سیاسی جماعتیں بننا شروع ہوئیں جیسے کانگرس، مسلم لیگ وغیرہ یاد رہے! تقسیم ہند سے پہلے کئی ایک مراحل سے "ہندوستان" گزرا ہے۔ کبھی حقوق و فرائض پر بحث ہے اور کبھی قائد اعظمؒ کے 14 نکات نظر آتے ہیں۔ "آل انڈیا جمعیت علمائے ہند" ہم پہلے کی طرح ہندوئوں کے ساتھ ہی وقت گزاریں گے۔ یہ تو قائد اعظمؒ کی چشم بیتا تھی، مذہبی، اخلاقی زندگی الگ اور ہندوئوں کی الگ۔ ہم اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکتے ہیں اور وہ "گائو ماتا" کی پوجا کرتے ہیں اور بُتوں کے آگے جھکتے ہیں۔ اسی کے پیشِ نظر قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے ایک الگ وطن لینا ہی بہتر سمجھا اور اسی کا مطالبہ

کیا۔ بالآخر ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کیا گیا...اب سارے انڈیا کو تقسیم ہونا تھا۔ پاکستان اور بھارت میں۔ اسکے علاوہ دیسی ریاستوں میں سے جو آزاد رہنا چاہیں گی ان کو بھی یہ اختیار حاصل ہو گا۔ یہ فیصلہ 565 سب دیسی ریاستوں کے لیے تھا۔ ظاہر ہے ان دیسی ریاستوں کا فیصلہ ان کے حکمران (راجہ۔ مہاراجہ، والی، خان وغیرہ) کو دیا گیا۔ جموں وکشمیر کا حکمران راجہ ہری سنگھ نے پاکستان کے ساتھ بات کی تو قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان، فوراً مان گئے اور 12 اگست 1947ء کو یہ معاہدہ طے پا گیا اور دونوں نے دستخط بھی کر دیئے۔

یاد رہے! 14 اگست 1947ء کو پورے کشمیر میں چراغاں کیا گیا اور پاکستان کے پرچم کو راجہ ہری سنگھ نے سلامی بھی دی۔ گویا اسی دن "پاکستانی پرچم" جموں وکشمیر میں لہرا دیا گیا۔ آزادی کا جشن منایا گیا۔ پاکستان کے حصے میں ریل، خوراک اور مواصلات آئے۔ ایک ماہ بعد وہ ریل جو جموں وکشمیر کو سیالکوٹ سے جاتی تھی بند کر دی گئی۔ قبائلی حملہ جموں وکشمیر پر کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے کشمیر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک مقبوضہ کشمیر، دوسرا آزاد کشمیر۔ فریقین کے دستخط ہونے کے باوجود۔ اس بارے میں قائداعظمؒ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز"-17 جون 1947ء کی شہ سرخی تھی "STATE CAN CHOOSE TO BE INDEPENDENT OPTION NOT LIMITED INDIA OR PAKISTAN" :

تو گویا جو (STAND STILL ACREEMENT) پاکستان کے ساتھ ہو چکا تھا، اس کا احترام کرنا لازم تھا۔ حالانکہ کشمیر تنازعہ کا مسئلہ نہ تھا۔ کیوں بنا؟ دوطرفہ تنازع ہم نے خود بنایا علاقے کا تنازعہ بھی بنا۔

12 اگست 1948ء کو سیکورٹی کونسل نے قرارداد پاس کی کہ کشمیر میں استصواب ہو گا۔ کشمیریوں کی مرضی ہے جس کے ساتھ چاہیں، الحاق کر لیں۔ چاہیں تو بھارت کے ساتھ الحاق کریں، چاہیں تو پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں اور اگر چاہیں تو آزاد رہیں۔ اس قرارداد کے نتیجہ میں پاکستان کی فوج کو کشمیر سے نکال دیا لیا اور ایسے ہی ہندوستان کی فوج کو بھی ہندوستان ایک عالمی تنازع بن گیا۔ قائداعظمؒ -11 ستمبر 1948ء کو وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون آنے والی نااہل حکومتوں نے جو حشر پاکستان کا کیا، وہی کشمیر کا بھی کیا۔

5-جنوری1949ء کو نئی قرارداد آئی سیکورٹی کونسل کی طرف سے۔ جس میں (UN MILITARY OBSERVERS) آئے۔ مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کی حدبندی ہوئی۔ وہاں پر مقرر ہوئے۔ شروع ہی سے سویڈن کے پانچ فوجی وہاں موجود ہیں۔

اس قرارداد کے نتیجہ میں جو مشن مقرر کیا گیا اس کا نام (UNITED NATION MISSION IN INDIA AND PAKISTAN) ہے۔ حالانکہ اس مشن کا نام (UNITED NATION MISSION IN KASHMIR) ہونا چاہیئے تھا۔ دیکھئے! تنازع اور مسئلہ تو کشمیر کا ہے جس کا سرے سے نام ہی نہیں شامل کیا گیا۔ آخر کیوں؟ اس سوال کا بھی جواب چاہیئے؟

یاد رہے! پاکستان سے مہاراجہ کشمیر راجہ ہری سنگھ نے (STAND STILL ACREEMENT) کر لیا تھا۔ آگے اسے "الحاق" کی شکل تک پورا کرنا تھا جو نہ کیا گیا۔ آخر کیوں؟ یہاں پر چند ایک سوالات اٹھتے ہیں جن کا جاننا ضروری ہے تاکہ صحیح صورتحال سامنے آسکے۔

آخر مسئلہ کشمیر کیسے حل ہو گا؟

کشمیر سلگ رہا ہے اور دنیا یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔ اس خطے کو کسی نے جنت نظیر کہا کسی نے ایران صغیر کہا کچھ نے فردوس بریں کہا لیکن اس کے قدرتی حسن کی تعریف مکمل نہ ہوئی۔ آج یہی کشمیر ظلم کی چکی میں پس رہا ہے اور کوئی اس کی فکر نہیں کر رہا۔ یہاں تک کہ مسلمان ممالک بھی یہ نعرے سننے سے انکاری ہیں آخر کیوں اور کب تک۔ آخر کیوں کشمیر کی آزادی دنیا کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں وہ دنیا جو جانوروں کے حقوق کی بات کرتی ہے وہ یہاں انسانوں کے حقوق سے کیوں لاپرواہ اور بے خبر ہو جاتی ہے اور یہ کچھ آج سے نہیں ہو رہا بلکہ دہائیوں سے ہو رہا ہے۔ برصغیر تقسیم ہوا تو کشمیریوں کی بھی امید بندھی بلکہ انہیں یقین تھا کہ مسلم اکثریتی ریاست ہونے کی وجہ سے وہ پاکستان میں ہی شامل ہونگے لیکن ایسا نہ ہوا اور مزید جرم یہ ہوا کہ اس کے ڈوگرہ راجہ ہری سنگھ نے بھارت سے الحاق کر لیا ظاہر ہے کہ یہ الحاق نہ کشمیریوں کو قبول تھا اور نہ ہی پاکستان کو۔ یہی مسئلہ کشمیر ہے جو پاکستان اور بھارت کے درمیان تمام مسائل کی جڑ ہے جب تک بھارت کشمیر کو آزاد نہیں کرتا تب تک خطے میں امن کے قیام کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ بھارت نے ایک سال قبل جو کالا قانون پاس کیا اس کے بعد سے اب تک کشمیر میں کرفیو اور لاک ڈاؤن برقرار ہونا نا صرف افسوسناک ہے بلکہ قابل مذمت بھی ہے۔ ہندوستان کو مسلہ کشمیر پر عالمی سطح پر جس قسم کی مذمت کا سامنا ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ حالانکہ بھارتی آئین میں کشمیر کی حیثیت تبدیل کرنے پر ہندوستان اور دنیا بھر میں اس پر احتجاج ریکارڈ کروایا گیا مگر حسب معمول بھارت کے سر میں جوں تک نہیں رینگی۔ کشمیر میں اس وقت تک مواصلات کے تمام ذرائع بند ہیں اور ہندو آباد کاری زور و شور سے جاری ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کا کردار بھی صرف مذمتی قرار دادوں اور پانچ فروری اور اب پانچ اگست کو ملک گیر احتجاج سے بڑھ کر اور کچھ نہیں پاکستانی حکومت کی طرف سے کوئی عملی اقدامات ابھی تک نہیں کئے گئے کہ جن کی اُمید موجودہ حکومت سے کی جا رہی تھی بہرحال دوسری طرف حکومت کا حال ہی میں نیا سیاسی نقشہ دنیا کے سامنے لانا اس مقصد کی طرف پہلا قدم ہے ضرور ہے مگر اس پر ابھی بہت سا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کو اس مسئلے کے حل کے لیے نیا لائحہ عمل تیار کرنا ہو گا۔ اب روائتی طریقوں سے ہٹ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کشمیری جو اپنے پاکیزہ لہو کا خراج پیش کر رہے ہیں وہ ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ کب تلک ان

مظلوم کشمیریوں کو ان کا حق نہیں ملے گا، آخر کب تک ان کی صدا کو اقوام عالم کے مردہ ضمیروں کے سامنے دبنا ہو گا آخر کب یہ نام نہاد مسلمان حکمران کشمیریوں کا عملی طور پر ساتھ دیں گے، آخر کب تک ان کے مقدر میں یہ ظلم و جبر کی تاریک راتیں رہیں گی؟۔ یہ ناانصاف دنیا ہمیشہ سے ہی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتے آئے ہیں۔ کشمیری مسلمان اور فلسطینی عرب مسلمان 70 سالوں سے ایک آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن کامیابی دور دور تک کہیں بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ، صہیونیوں کی زیادتیاں اور ریاست اسرائیل کی ناانصافیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور سنا جا چکا ہے مسئلہ فلسطین برطانیہ کا پیدا کردہ ہے جس کی ساخت پرداخت امریکی صہیونی عیسائی کر رہے ہیں۔ یہودی، امریکی انتظامیہ کے تحت فلسطینی مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں دوسری طرف مسئلہ کشمیر بھی برطانوی استعمار کا پیدا کردہ ہے ہنود، برطانوی و امریکی صہیونی لابی کی آشیر باد کے ساتھ کشمیری مسلمانوں کا حقِ خود ارادیت صلب کر کے انہیں مستقل غلام بنانے کی راہ پر گامزن ہیں گزشتہ سال 5 اگست 2019ء کو مودی سرکار نے مقبوضہ کشمیر کی آئینی حیثیت تبدیل کر کے اسے انڈین یونین میں ضم کر لیا ہے کشمیریوں کے ممکنہ رد عمل سے بچنے کے لئے مودی سرکار نے یہاں سیکیورٹی فورسز کی تعداد 9 لاکھ تک بڑھا دی ہے یہاں ایک سال سے کرفیو جیسی صورتحال ہے۔ لاک ڈاؤن پوری عسکری ریاستی قوت کے ساتھ نافذ العمل ہے کمیونیکیشن کے ذرائع بھی مفلوج کر دیئے گئے ہیں ٹیلی فون، انٹرنیٹ اور ابلاغ کے دیگر ذرائع کا گلہ گھونٹا جا چکا ہے۔ غیر ملکی صحافیوں کو تو یہاں آنے کی اجازت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حد تو یہ ہے کہ لوکل میڈیا کی بھی زبان بندی کی جا چکی ہے۔ مودی سرکار کی مسلمان کش پالیسی ہی نہیں بلکہ اقدامات کے باعث کشمیری مسلمان یک زبان ہو چکے ہیں اور ان کا ایک ہی نعرہ ہے آزادی اور پاکستان، کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو ویسے تو طویل عرصہ ہو چکا ہے لیکن تحریک الحاق پاکستان کی جدوجہد کو 72 سال گزر چکے ہیں۔ تقریباً اتنا ہی عرصہ فلسطینی مسلمانوں کی تحریک آزادی کو ہو چکا ہے۔ تحریک آزادی نے 5 اگست 2019ء میں ایک نیا ٹرن لیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ مودی سرکار نے بھارتی سیکیولرازم کا نقاب الٹ کر دنیا کو اسکا اصلی چہرہ دکھا دیا ہے۔ ہندوستان کبھی بھی جمہوری اور سیکیولر ریاست نہیں تھا وہ ایک ہندو، بلکہ متعصب ہندو ریاست تھا اور مودی نے آکر اس کا اصلی چہرہ دنیا کے سامنے ظاہر کر دیا ہے کشمیری مسلمان تو 1947ء میں تقسیم ہند سے پہلے بھی غلامی کی زندگی ختم کرنے کے

لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ڈوگرہ حکمرانوں کے جبر و ستم کا نشانہ تھے۔ قیامِ پاکستان کی تحریک نے انہیں کامیابی و کامرنی کی جدوجہد کا یقین دلایا۔ حتیٰ کہ 1947ء میں تقسیم ہند پلان کے تحت کشمیر پاکستان کا حصہ بننے جا رہا ہے لیکن کانگریسی حکمرانوں نے سازش کے تحت مسئلہ کشمیر پیدا کیا۔ آزادی کشمیر کی تحریک تحریک الحاق پاکستان میں بدل گئی۔ 2019ء میں اس تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی ہے اب تو ہندوستان میں بھی عدل پسند اور لبرل عناصر مسلمانوں کے ساتھ ان کے حقوق کی بازیابی کے لئے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ ایٹمی پاکستان اور ہماری عظیم مسلح افواج تحریک الحاق پاکستان کی ضامن ہیں۔ ان شاء اللہ کشمیر بنے گا پاکستان۔

کشمیر کا مسئلہ کیوں حل نہیں ہو رہا ہے؟

کشمیر کا مسئلہ کیوں حل نہیں ہو رہا ہے؟

کشمیر کا مسئلہ کیوں حل نہیں ہو رہا ہے؟

ظہیر اختر بیدری جمعہ 2 ستمبر 2016

zaheer_akhter_beedri@yahoo.com

بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن پر ان کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر بار بار لکھنا پڑتا ہے، ایسے خصوصی بلکہ سنگین مسائل میں مسئلہ کشمیر بھی شامل ہے، پچھلے 69 سال سے اس مسئلے پر لکھا جا رہا ہے۔ ایک حلقہ

وہ ہے جو مسئلہ کشمیر پر آنکھ بند کر کے بھارتی موقف کی حمایت کرتا ہے، دوسرا طبقہ فکر وہ ہے جو آنکھ بند کر کے پاکستان کے موقف کی حمایت کرتا ہے۔ یہ دونوں متضاد طبقہ ہائے فکر مسئلہ کشمیر کے حل میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کرسکتے۔ اس مسئلے کے حل میں ایک ایسے تیسرے حلقہ فکر کی اہمیت اور ضرورت ہے جو نہ بھارتی فکر کا ہمنوا ہو نہ پاکستانی موقف کا، بلکہ اس حلقہ فکر کا وژن انسانیت کی اجتماعی بھلائی ہو۔ ایسے حلقہ فکر کی صرف مسئلہ کشمیر کے حوالے ہی سے ضرورت نہیں ہے بلکہ دیگر عالمی مسائل کے حل میں بھی یہ حلقہ فکر اہم اور مثبت کردار ادا کرسکتا ہے۔

کشمیر کے مسئلے کی عمر اب لگ بھگ 69 سال ہو رہی ہے، اس دوران یہ مسئلہ کئی نشیب و فراز سے گزرا ہے، اس نشیب و فراز میں دو بڑی جنگیں بھی آئی ہیں اور دوستی اور بھائی چارے کے دور بھی آئے۔ آج مسئلہ کشمیر جس دور سے گزر رہا ہے وہ بڑا سنگین اور بڑا پر خطر دور ہے۔ پچھلے لگ بھگ دو ماہ سے کشمیر کرفیو کی زد میں ہے اور اس دوران سیکڑوں کشمیری مارے جاچکے ہیں اور ہزاروں زخمی ہو چکے ہیں۔

سری نگر پر ایک پر ہول سناٹا طاری ہے، اس سناٹے کو یا تو کشمیری عوام کے نعرے توڑ رہے ہیں یا بھارتی فوج کی طرف سے چلائی جانے والی گولیاں۔ ایک کشمیری نوجوان جو کشمیریوں کا ہیرو بنا ہوا تھا جب بھارتی فوجوں کی گولیوں سے جاں بحق ہوا تو کشمیر میں جیسے آگ لگ گئی۔ لاکھوں کشمیری سڑکوں پر نکل آئے اور انھیں کنٹرول کرنے کے لیے بھارتی فوج نے گولیاں چلائیں۔ برہان وانی کی موت سیکڑوں کشمیریوں کی موت اور ہزاروں کشمیریوں کے زخمی ہونے میں بدل گئی۔ کسی بھی تحریک میں جب عوام شامل ہو جاتے ہیں تو ایسی تحریکیں خون آلود ہونے کے ساتھ فریقین کو یہ احساس بھی دلاتی ہیں کہ فیصلے کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کے فیصلے درست ہیں یا نہیں؟

اس سے قبل کہ مسئلہ کشمیر کا تیسرے حلقہ فکر کی حیثیت سے جائزہ لیا جائے، آج کے اخبارات میں شایع ہونے والی کچھ خبروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو روایتی (کشمیر کے حوالے سے) خبروں سے مختلف نظر آتی ہیں۔ ایک خبر کے مطابق بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں مختلف تنظیموں پر مشتمل اتحاد نے راج گھاٹ پر ایک بڑا مظاہرہ کیا، یہ مظاہرہ بھارتی فوج کے ہاتھوں نہتے کشمیریوں کے قتل کے خلاف کیا گیا۔ سول سوسائٹی کے گروپوں کی جانب سے جاری ایک مشترکہ بیان میں مسئلہ کشمیر کو پر امن بات چیت کے

ذریعے حل کرنے اور کشمیر میں خطرناک ہتھیاروں کا استعمال بند کرنے کی اپیل کی گئی۔ کشمیری رہنما آسیہ اندرابی نے کہا ہے کہ پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کرنا اچھی بات ہے۔

ایک بھارتی سیاستدان اور بہوجن سماج پارٹی کی سربراہ مایاوتی نے کہا ہے کہ ”نریندر مودی کشمیر میں تشدد کو ہوا دے رہے ہیں ان کے دور میں فرقہ پرست جماعتیں بہت مضبوط ہو گئی ہیں“۔ بھارتی اپوزیشن جماعت کے رہنما مانی شنکر نے کہا ہے کہ کشمیری آزادی چاہتے ہیں۔ فوجی ایکٹ اور تشدد ان کی جدوجہد آزادی کو نہیں روک سکتے۔

انھوں نے کہا ہے کہ اب کشمیری ایک نئے عزم کے ساتھ آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ کشمیر کے اسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھوں پر آزادی کے نعرے درج ہیں۔ بھارت کی خفیہ ایجنسی ”را“ کے سابق سربراہ نے اکنامک ٹائمز کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ برہان وانی کشمیریوں کے لیے ایک آئیکون تھا جسے بھارتی فورسز نے دہشت گرد قرار دے کر 8 جولائی کو قتل کر دیا۔ کشمیری عوام نے جب اس قتل کے خلاف احتجاج شروع کیا تو بھارتی افواج نے اس کا جواب ظالمانہ طریقے سے دیا، جس میں سیکڑوں کشمیری ہلاک ہزاروں زخمی ہو گئے۔

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے دونوں ملکوں کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام آباد میں ہونے والی سارک کے وزرائے داخلہ کی کانفرنس سے بھارتی وزیر داخلہ راج ناتھ اٹھ کر چلے گئے۔ پاکستان نے بھارتی حکومت کو مذاکرات کی دعوت دی جس کے جواب میں بھارتی حکومت نے کہا کہ وہ مذاکرات کے لیے تیار ہے، لیکن مذاکرات میں مسئلہ کشمیر شامل نہیں ہو گا، صرف دہشت گردی پر مذاکرات ہوں گے۔ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے ایک ریڈیو پروگرام میں کہا ہے کہ کشمیر میں کوئی نوجوان مارا جائے یا فوجی اہلکار نقصان ہمارا ہی ہے کیونکہ ”یہ سب لوگ ہمارے ہی ہیں۔“

حکومت پاکستان نے کشمیر کے مسئلے کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کے لیے ملک کے 22 ”اکابرین“ کو ذمے داری سونپی ہے۔ جو دنیا کے ملکوں میں جا کر کشمیر کے مسئلے سے آگاہ کریں گے۔ اس حوالے سے تشویش ناک بات یہ ہے کہ بھارتی حکومت نے کشمیر میں جاری جدوجہد کے جواب میں بلوچستان، گلگت بلتستان کی آزادی کی جدوجہد کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ یہ صورتحال کسی بھی وقت دنیا کے ان پسماندہ ترین ملکوں

کے درمیان جنگ کا باعث بن سکتی ہے چونکہ دونوں ہی ملک ایٹمی ہتھیار رکھتے ہیں لہذا ان کے استعمال کے خطرات کو غیر امکانی نہیں کہا جا سکتا۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اس لیے حل نہیں ہو رہا ہے کہ دونوں ملکوں کے رہنما ہندو، مسلمان اور پاکستانی اور ہندوستانی بن کر اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس مسئلے کو انسانی مسئلہ سمجھ کر انسانیت کی سربلندی کے پس منظر میں حل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ دنیا میں پیدا ہونے والا ہر بچہ انسان کا بچہ ہوتا ہے اسے ہم ہندو، مسلمان، آزاد کشمیری، مقبوضہ کشمیری، ہندوستانی اور پاکستانی بنا کر اسی طرح بر سر پیکار کر دیتے ہیں کہ وہ دائرہ انسانیت سے باہر نکل جاتا ہے۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

اس ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بھی بے کار نہیں پیدا کی۔ ہر چیز کو مقصد کے تحت بنایا گیا. حضرت انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے کو خالق دو جہاں نے ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا انسان کی پیدائش کا مقصد بیان کرتے ہوئے قرآن پاک فرماتا ہے
ترجمہ
"بے شک ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا"

اس کائنات کی باقی تمام چیزیں انسان کے لیے بنائی گئی ہیں. یہ دریا پہاڑ جنگل صحرا شجر و حجر چرند پرند یہ آسمان سورج چاند ستارے یہ سب کچھ انسان کے لیے بنایا گیاہے۔ یہ چیزیں انسان کی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ یہ سارا جہاں تو انسان کیلئے بنایا گیا ہے اور خود انسان کو اللہ تعالی نے اپنی عبادت کے لیے بنایا۔
اللہ تعالیٰ انسان سے بے حد محبت فرماتے ہیں جب کبھی انسان راہ راست سے بھٹکتا ہے تو اللہ تعالی ان کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے اپنے پیغمبر معبوث فرماتے ہیں وہ پیغمبر انہیں سیدھی راہ دکھاتے ہیں اور انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد کرواتے ہیں.
مجھے کیا بننا چاہیے اور میرا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟؟؟ اس کے لیے مجھے نہ تو کسی مشورہ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی رائے طلبی کی حاجت مجھے اپنے نشان منزل کی تلاش اور جستجو میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ قرآن کی روشنی میں ہماری منزل بھی متعین ہے کہ اور راہ بھی بہت صاف ہے منزل پہ پہنچ گئے تو کسی سے نہ صلے کی تمنار کھنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی ستائش کی طرف توجہ اور اگر منزل پر پہنچ گئے تو اس راستے کی کوششیں اور اس وادی کاسفر نفع سے خالی نہیں۔ اور میں ہر وہ کام کروں گی جو انسانیت کی خدمت پر مبنی ہو۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ انسان بننے کے بعد معلم انسانیت بننا میرا پسندیدہ شوق ہے اس لیے کہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالی نے معلم بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے ذات پات رنگ و نسل کے تفاوت ختم کر دیا اور اعلان کیا کہ کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فوقیت نہیں۔ ہاں وہ آدمی جس میں حقیقی انسانیت اور ابدیت موجود ہو وہ لائق تعظیم و تکریم ہے۔

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

میری زندگی کا مقصد دین اسلام کی سربلندی و سرفرازی ہے میں ساری دنیا تک دین اسلام کا پیغام پہنچا دینا چاہتی ہوں تاکہ کل قیامت کے روز کوئی مسلمان گریبان پکڑ کر نہ کہے کہ اے اللہ اس کے پاس ایمان کی دولت تھی اس نے ہم تک نہیں پہنچائی میں جب تک زندہ رہوں گی دین کی خدمت اور اس کی عظمت کے لیے کوشاں رہوں گی یہ میرا فرض ہے اور میری ہمیشہ ہمیشہ کامیابی کا ذریعہ بھی اللہ تعالی سے دعا ہے کہ تمام انسانوں کو ہدایت کی دولت سے نوازے اور دنیا میں دین اسلام کو سربلندی عطا فرمائے آمین

میری دعا ہے کہ نور حق دنیا میں عام ہو جائے
سب پرچموں سے اونچا پرچم اسلام ہو جائے

نصب العین

پی ایس او کو ایک جدید اور متحرک انرجی کمپنی کی حیثیت سے قائم رکھتے ہوئے صارفین کو سہولیات فراہم کرنا۔

مقصد

ہم صارفین کو اعلیٰ ترین پیٹرولیم مصنوعات اور سروسز فراہم کرکے انرجی کمپنیوں میں سبقت لے جانے کے لئے پُر عزم ہیں،

- تربیت یافتہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پُر عزم عملے کی صورت میں پیشہ ورانہ طور پر ایسے ماحول کی فراہمی جس میں کارکردگی، جدت اور تخلیقی صلاحیتوں کو سراہا جاتا ہے اور جو ذاتی ترقی کے مواقع مہیا کرتا ہے۔
- کم ترین لاگت میں کاروباری امور کی انجام دہی اور طویل المدت اور وسائل کی کم لاگت میں فراہمی کی یقین دہانی۔
- حقیقی آمدنی میں مسلسل اضافہ
- اعلیٰ اقدار، محفوظ، ماحول دوست مصنوعات کی فراہمی اور سماجی ذمہ داری کے ساتھ کاروبار کی انجام دہی۔

اقدار

- **ہمارا امتیاز**

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اپنی بنیادی سرگرمیوں میں معیار کے حوالے سے صارفین کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے جذبے کے ساتھ مارکیٹ میں برتری حاصل کریں۔ ہماری اولین ترجیح اپنی برتری برقرار رکھنا ہے۔

- **اتحاد/یکجہتی**

ہم ٹیم ورک کے ذریعے اجتماعی اور انفرادی مقاصد حاصل کرنے کے لئے سرگرم ہیں۔ یہ بات ادارے میں موثر ابلاغ کے ذریعے ممکن بنائی جاتی ہے۔

- **عزت و احترام**

ہم ملازمت کے مساوی مواقع مہیا کرتے ہیں اور ملک بھر سے بہترین لوگوں کو بھرتی کرتے ہیں۔ ہم انفرادی اور اجتماعی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انفرادی کارکردگی اور شراکت کو ہمارے اعزاز اور ستائش کے ذریعے سراہا جاتا ہے۔

- **اخلاقی اصولوں کی پاسداری**

ہم ہر کام اور فیصلے میں اپنی اقدار اور کاروباری اخلاقی اصولوں کی بالا دستی قائم رکھتے ہیں۔ پیشہ ورانہ اور ذاتی ایمانداری، لگن اور پختہ عزم ہماری کامیابی کی مثال ہیں۔ اخلاقی اقدار اور ملازمین کا احترام، کمیونیٹیز اور ماحول، شفاف کاروباری طرزِ عمل پر مبنی ہیں۔

- **جدت**

ہم نئی مصنوعات اور طریقہء کار اور پہلے سے موجود مصنوعات میں مسلسل بہتری کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ ہم تمام حصص یافتگان کی جانب سے تخلیقی خیالات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

- **سماجی ذمہ داری**

ہم اندرونی اور بیرونی طور پر صحت، تحفظ اور صاف ماحول کو فروغ دیتے ہیں۔ ہم کمیونیٹیز کی ترقی پر بھرپور توجہ دیتے ہیں اور معاشرے کی بہتری کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔

زندگی کا نصب العین

زندگی کا نصب العین

زندگی کا نصب العین

شیئر ٹویٹ

مولانا حافظ زبیر حسن اشرفی جمعہ 20 ستمبر 2019

شیئر ٹویٹ شیئر ای میل تبصرے

مزید شیئر

مزید اردو خبریں

کیا ہم نیک کام کرنے والے مومنین کو ان لوگوں کی طرح رکھیں گے جنہوں نے زمین میں فساد پھیلایا؟ فوٹو: فائل

اسلام کے تمام شعبوں کو اگر دیکھا جائے چاہے وہ عبادات ہوں یا معاملات، اخلاق ہوں یا آداب‘ معاشرت ہو یا معیشت ان سب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ان سب ہدایات کا اصل مقصد اعلیٰ کیا ہے۔

لفظ مقصد اور نصب العین میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جس بات کے لیے ہم کوئی کام کریں وہ بات اس کام کا مقصد ہوتا ہے لیکن نصب العین مقصد اعلیٰ کو کہتے ہیں۔ جیسے ہم محنت مزدوری کریں یا تجارت کریں تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ روپیا پیسہ حاصل ہوگا، زندگی گزارنے کا سامان پیدا ہوگا، یہ تجارت و صنعت کا مقصد ہے۔

لیکن اس کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو پورا کرتے ہوئے ہم روزی کمائیں پھر اپنے بیوی بچوں، اپنے والدین اور اپنے بہن بھائیوں کے اخراجات کو پورا کریں، رشتے داروں، غرباء اور مساکین کا خیال رکھیں کیوں کہ ان تمام باتوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یہ تجارت کا مقصد اعلیٰ ہے جسے نصب العین کہتے ہیں۔ اگر مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان کا نصب العین صرف اور صرف اطاعت الٰہی ہے۔

اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر بے مقصد زندگی گزاری جائے تو پھر یہ انسان، انسانیت کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے جب کہ ایک بے شعور بچہ بھی ماں کی گود میں بے مقصد نہیں روتا۔ یا اسے بھوک لگتی ہے یا کوئی تکلیف ہوتی ہے تو پھر ایک عقل مند انسان بے مقصد زندگی گزارنے کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اسی بات کو سوالیہ انداز میں خود انسان سے پوچھا، مفہوم: ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے کار پیدا کیا۔“

یہ اللہ رب العزت کا حکیمانہ انداز ہے کہ خود انسان کو اس بات پر غور و فکر کرکے قائل کروالیا جائے کہ تمہارا کوئی نصب العین ہونا چاہیے اگر انسان کا نصب العین نہ ہو تو پھر نیک آدمی کو کس طرح نیکی پر آمادہ کیا جاسکے گا؟ بُرے شخص کو بُرائی سے کس طرح روکا جاسکے گا؟ اس لیے کہ نیک کام کی خواہش اور بُرے کام سے پرہیز جب ہی ممکن ہے جب کوئی نصب العین ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ کا مفہوم ہے:"کیا ہم نیک کام کرنے والے مومنین کو ان لوگوں کی طرح رکھیں گے جنہوں نے زمین میں فساد پھیلایا؟ کیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں کی طرح رکھیں گے۔؟"

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے اس وقت سے آج تک پوری انسانیت کا نصب العین صرف ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا ہے، یعنی انسان کو اپنے رب کو پہچاننا چاہیے اور جس طرح اُس نے حکم دیا ہے اُس کے مطابق اپنی زندگی کو گزارنا چاہیے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کا نصب العین صرف ایک ہی تھا کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس ارشاد نبویؐ کو ذہن میں نقش کر لیا جائے۔

رسول کریمؐ کے ارشاد گرامی کا مفہوم ہے:"میں نے تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے گم راہ نہ ہو گے، ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔"

بخاری شریف کے "باب الزکوٰۃ من الاسلام" کی پہلی روایت میں ایک صحابیؓ کو رسول اللہ ﷺ نے اسلامی تعلیمات سکھائیں آپؐ کے ارشادات کو سن کر جب وہ صحابیؓ جانے لگے۔ تو انہوں نے کہا:"خدا کی قسم میں اس میں نہ زیادتی کروں گا نہ اس میں کمی کروں گا۔"

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"اگر یہ سچ کہتا ہے تو کام یاب ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اطاعت الٰہی صرف جب ہی ممکن ہے جب ان دونوں راستوں کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے۔ کیوں کہ یہی نصب العین فلاح و کام یابی کا راستہ ہے۔ لیکن مسلمان اگر اپنا نصب العین کچھ اور بنا لیں، آخرت کی طرف سے رخ موڑ کر دنیا کو مقصد اعلیٰ قرار دے لیں تو وہ مقصد بھی ضرور حاصل ہو گا۔ لیکن ہم اصل نصب العین سے ہٹ کر الگ ہو جائیں گے اور سوائے خسارے کے کچھ بھی نہ ملے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ کا مفہوم ہے کہ جو شخص دنیا کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی میں اور اضافہ کریں گے، اگر کوئی شخص صرف دنیا کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اسے دے دیں گے لیکن آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔

اللہ رب العزت ہمیں ہر کام میں خلوص اور محض اطاعتِ الٰہی کے لیے اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔
آمین

میرا نصب العین مضمون 2021

"میرا نصب العین " مضمون کی اہمیت سال دوم کے لیے بڑھ جاتی ہے کیونکہ اکثر طلباء اس کلاس کے بعد پروفیشنل تعلیم کی طرف چلے جاتے ہیں۔زندگی میں دو نصب العین کو مدِ نظر رکھا جا سکتا ہے۔ اسی تناظر "میرا نصب العین" میں یہ مضمون لکھا گیا ہے۔اس کو زندگی کا نصب العین, ہمارا نصب العین, میرا نصب العین, نصب العین جیسے موضوعات کے تحت بھی لکھا جا سکتا ہے۔

میرا نصب العین

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی

میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

کائنات میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی چیز بیکار اور بغیر مقصد کے پیدا نہیں کی۔انسان کی تخلیق احسن تقویم ہوئی ہے۔اس کی زندگی کے مقاصد کا تعین قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ :"(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بے شک ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی ہی عبادت کے

لیے پیدا فرمایا"

اسلام نے تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے ہدیات اور مقاصد کا تعین کر دیا ہے ۔ لفظ مقصد اور نصب العین میں تھوڑا سا فرق ہے ۔ کسی چیز یا بات کے لیے کیے جانے والا کام مقصد کہلاتا ہے اور زندگی کے سب سے اہم مقصد کو نصب العین کہلاتا ہے ۔ مثلاً تجارت اور کاروبار کا بظاہر مقصد دولت کمانا اور زندگی کی آسائشوں کا حصول ہے ۔ لیکن اس کا اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تحت حلال طریقے سے روزی کمائیں ؛ والدین اور بیوی بچوں کے حقوق پورے کیے جائیں اس کے بعد رشتے داروں ، غرباء اور مساکین کا بھی خیال رکھیں جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے یہ تجارت کا مقصد اعلیٰ ہے جسے نصب العین بھی کہتے ہیں ۔ مسلمان کا نصب العین صرف اور صرف اطاعت الٰہی ہونا چاہیے ۔
میں سمجھتا ہوں انسان کا بے مقصد زندگی ایک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں یا ایک سفر ہے جس کی کوئی منزل نہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں خود انسان سے پوچھا، جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے کار پیدا کیا۔
اسی لیے میں نے بھی اپنی زندگی کا نصب العین کا تعین کر لیا ہے ۔ میری زندگی دو مقاصد کے گرد گھومتی ہے ۔

1: اللہ کی رضا کے مطابق دینِ اسلام کی سربلندی

2: وطنِ عزیز پاکستان کی حفاظت اور ترقی

میری زندگی کا مقصد دین اسلام کی سربلندی و سرفرازی ہے بحیثیت مسلمان میری زندگی کا سب سے بڑا نصب العین اسلامی تعلیمات کا فروغ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے

کے لیے قرآن و سنت کی پیروی اور رضائے الٰہی کو سب پر فوقیت دینا بھی اس میں شامل ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے :

"اے ایمان والو! اسلام میں پُورے پُورے داخل ہو جاؤ"

پوری طرح مذہب میں داخل ہونے کا مطلب ہے کہ ہم اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تقاضوں میں اِحکاماتِ شریعت اور احکاماتِ دینِ سے غافل نہ ہونے پائیں - نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کو اپنی زندگی میں کبھی نہیں چھوڑنا۔

کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّتِ رَسُوْل

ترجمہ: اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے

آج کے نوجوانوں کو کبھی سوشل ازم ، کبھی کیمونزم اور کبھی سیکولرازم کی چکا چوند روشنیوں سے دھوکا دیا جا رہا ہے جب کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ دین اسلام عظمت و صداقت میں سب ادیان سے بہتر ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کیلئے بہترین طرزِ حیات ، بُودوباش، قانون و آئین ، بہترین اُصول، نظامِ زندگی اور بہترین ضابطۂ حیات کے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

"آج میں نے تُمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تُم پر اپنی نعمت پوری کر دی

اور تُمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین (مکمل نظام حیات کی حیثیت سے) پسند کر لیا"

میں چاہتا ہوں کہ اپنی ساری زندگی دینی تعلیمات کے تحت گزاروں۔ مادیت پرستی اور فریبِ دنیا کے سحر سے بچوں اور ان لوگوں سے دور رہوں جنہوں نے مذہب کو ایک کھیل تماشا بنا کر مذہب کو نجی اور انفرادی معاملہ بنا کر خود کو ناپاکیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اللہ تعالی نے بھی ایسے لوگوں کو وعید سنائی ہے کہ جس طرح انھوں نے دنیا میں میری آیتوں سے غفلت برتی اسی طرح روزِ قیامت میں بھی ان کو بھول جاؤں گا۔

میں کوشش کرتا ہوں کہ تمام کام جو حقوق اللہ یا حقوق العباد کے ہوں ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے مرتّب کردہ اصولوں کے مطابق کروں۔ علم ہو یا عمل، تجارت ہو یا معیشت، نظام زندگی ہو یا عقائد کی بات بہترین راستہ قرآن و سنت میں ہی ہے۔ مجھے افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ آج ہمارے بہت سے نوجوان تہذیب مغرب کے دلدادہ ہیں۔ ایسے نوجوانوں کو اقبال نے پیغام دیا ہے کہ :

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسُولِ ہاشمی

اُن کی جمعیّت کا ہے مُلک و نَسَب پہ انحصار

قُوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تیری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھُوٹا تو جمعیّت کہاں؟

اور جمعیّت ہوئی رُخصَت تو مِلّت بھی گئی

میری زندگی کا دوسرا مقصد پاکستان ہے۔ جو مجھے دل و جان سے پیارا ہے میں اپنی زندگی کا ہر پل اپنے ملک کے استحکام اور مضبوطی کے لیے صرف کرنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں آپس کے جھگڑوں سے نکل کر ملک و قوم کی بقا، سلامتی، ترقی اور خوشحالی کے لیے آگے آنا چاہیے۔ بحیثیت طالب علم ہم سب پر سے زیادہ ذمہ داری آتی ہے کہ ہم اپنے ملک کی خوشحالی کے لیے دن رات ایک کر دیں کیونکہ نوجوان ہی ہر قوم کا ہراول دستہ ہوتے ہیں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

آؤ اپنے جسم چُن دیں اینٹ پتھر کی طرح

بے در و دیوار ہے لیکن یہ گھر اپنا تُو ہے

بحیثیتِ قوم ملکی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے متفق و متحد ہو کر مشترکہ کاوشیں کرنا ہوں گی اس کے لیے ہمیں تن من دھن قربان کرنا چاہیے اور ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم سب زندگی میں جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، جو کام بھی کر رہے ہوں، جس حالت میں بھی ہوں ہمیں اپنا نصب العین یاد رکھنا چاہئے کیونکہ جو اپنے نصب العین کو بھول جاتے ہیں ناکامی اور ذلت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

جسم و جان کو جلانا پڑے گا تمھیں

یوں اجالے ملیں گے نہ خیرات میں

نصب العین کے حصول اور ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی کے حصول کے لئے میرے پاس چند تجاویز ہیں۔

اتفاق و اتحاد کا فروغ:

"ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی" کے حصول کے لئے پوری قوم کو متحد اور متفق ہو

کر وطن کے لئے کام کرنا چاہئے اس سلسلے میں ہم سب پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہے کہ ہر

پاکستانی اپنی حیثیت ، ہمت اور طاقت کے مطابق اپنا اپنا کردار ادا کرے۔

افراد کے ہاتھو ں میں ہے ملت کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

فرقہ واریت اور تعصب کا خاتمہ:

علاقائی، لسانی، نسلی اور مذہبی تعصبات اور فرقہ واریت پھیلانے والوں کا خاتمہ کریں اس کے لیے نوجوانوں کو ہراول دستہ بننا پڑے گا۔ اخوت، بھائی چارے، رواداری، صبر و تحمل اور برداشت جیسے اعلی اقدار کو فروغ دینا ہوگا۔ ذات پات رنگ و نسل کے تفاوت کو ختم کرنا ہو گا اور صرف اس آدمی کو لائق تعظیم سمجھا جانا چاہیے جس کے اندر حقیقی انسانیت اور ابدیت موجود ہو۔

گھُن کی صورت یہ تعصب تجھے کھا جائے گا

اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر

خود اعتمادی اور خود انحصاری:

دنیا میں ایک عظیم قوم بننے کے لیے خود انحصاری اور خود اعتمادی کو پیدا کرنا پڑے گا۔ سہاروں اور بیسا کھیوں کی بجائے محنت کو شعار بنانا چاہیے۔ غیرت مند قومیں دوسروں سے کبھی مدد نہیں لیتی۔ وہ اپنی مدد آپ کے تحت رات دن محنت کر کے وسائل کا درست اور پورا پورا استعمال کرتی ہیں ۔

سہارا جو کسی کا ڈھونڈتے ہیں بحرِ ہستی میں

سفینہ ایسے لوگوں کا ہمیشہ ڈوب جاتا ہے

مضمون کے اختتام پر میں اپنے نصب العین کے حصول کے لیے ہر طرح کی کاوش کروں گا اور اپنے پیارے وطن اور دینِ اسلام کو دنیا میں ایک عظیم ترین دین اور ملک بنانے کے لئے بھرپور کردار ادا کروں گا ۔اور میری دعا ہے۔

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے

وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

نصب العین

اسی بات کو ایک بہت عظیم، مضبوط اور مدلل فلسفے کی حیثیت سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب "Manifesto of Islam" میں پیش کیا ہے) .ا (ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی قرآن کی نصوص کی روشنی میں تشریح و توضیح کی ہے. معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر سب سے بڑا جذبہ محبت کا جذبہ ہے. وہ کسی شے سے 'کسی ہستی سے یا کسی نظریے اور خیال سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے بھوکا رہنا گوارا کرتا ہے. اس کی جبلت میں تو یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹ کو بھرے' اپنی ذات کی بقاء (preservation of the self) کے تقاضے پورے کرے. لیکن اگر مقصدِ زندگی کی لگن چھا جائے تو انسان فاقے برداشت کرتا ہے. یہ جذبہ کسی بھی مقصد کے لیے بروئے کار آسکتا ہے' وطن کے لیے' قوم کے لیے' کسی نظریے کے لیے' جیسے ماضی میں کمیونزم وغیرہ کے لیے استعمال ہوا ہے.

حیوانی جبلت (animal instinct) تو یہ ہے کہ اپنی جان کو بچایا جائے' لیکن انسان کو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی محبوب شے کے لیے جان قربان کر دیا کرتا ہے. اس کی کئی مثالیں موجود ہیں' جیسے جاپانیوں نے جنگ عظیم میں کیا کہ چھاتہ بردار بم باندھ کر ہوائی جہاز سے کودے اور بحری جہاز کی چمنی میں اتر گئے. انہیں معلوم ہے کہ خود ان کے پرخچے اڑ جانے ہیں مگر ان پر وطن کی محبت چھائی ہوئی ہے. انسان کا کوئی نہ کوئی مطلوب ہو' کوئی آدرش ہو' کوئی نصب العین ہو) 'ا (اس کا ترجمہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے "منشورِ اسلام" کے نام سے کیا ہے' جو "حکمت قرآن" میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے اور اب کتابی صورت میں دستیاب ہے. (مرتب (کوئی آئیڈیل ہو' کوئی اس کا محبوب ہو' کوئی اس کا مقصود ہو' اس کے لیے وہ محنت کرے' ایثار کرے' اس کے لیے وہ بھوکا رہے' اس کے لیے وہ راتوں کو جاگے' اس کے لیے وہ جان کا رسک لے' جان قربان کر دے' اس کے لیے وہ پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈالے' یہ انسان کا بلند ترین اور سب سے زیادہ قوی جذبہ ہے. یہ جذبہ اصل میں اللہ کی محبت کے لیے پیدا کیا گیا ہے' لیکن فکری پستی کی وجہ سے انسان معرفتِ رب تک نہیں پہنچ پاتا. تو جیسے شدید بھوک میں آپ کسی گھٹیا غذا کو بھی قبول کر لیں گے جسے عام حالات میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے' آپ اس کو اضطرار کی حالت میں کھا لیں گے' اسی طرح جب انسان کی نگاہ اُس بلند ترین مطلوب و مقصود تک' اُس highest ideal تک' اُس

اصل محبوبِ حقیقی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کسی اور شے کو اُس کی جگہ رکھ کر اس سے وہی محبت کرنے لگتا ہے جو دراصل اللہ سے ہونی چاہیے. اس لیے کہ اندر کے جذبہ کو تسکین (satisfaction) درکار ہے. اُسے تو کوئی نہ کوئی محبوب چاہیے. اگر خدا تک نہیں پہنچے گا تو کسی اور شے کو پوجے گا' وطن کو پوجے گا' قوم کو پوجے گا' اپنے ہی نفس کو پوجے گا' اپنے ہی "حریم ذات" کے گرد طوف کرتا رہے گا۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رُست از یک بند تا افتاد در بندے دگر
)۱(
اور

اک تصور کے حسنِ مبہم پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے!

اگر وہ آرزو نہیں رہی' وہ امنگ نہیں رہی' کوئی نصب العین نہیں' کوئی آدرش نہیں' کوئی مطلوب و مقصود نہیں تو پھر یہ انسان محض ایک "human vegetable" ہے. یہ اصطلاح (human vegetable) آج کل بہت استعمال ہوتی ہے. یعنی وہ لوگ جو طبعی طور پر مر چکے ہوں لیکن ان کو مشینوں سے زندہ رکھا گیا ہو کہ دل بھی چل رہا ہے' خون بھی گردش میں ہے اور گردوں کے لیے بھی مشین کام کر رہی ہے' وغیرہ. یہ لوگ سالہا سال تک اسی طرح پڑے رہتے ہیں.

الغرض یہ ہے وہ فلسفہ جو قرآن مجید میں سورۃ الحج کے آخری رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے :ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ ﴿۷۳﴾ " بہت ہی کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی!" طالب و مطلوب کا ایک باہمی تعلق (relation) ہوتا ہے. انسان کسی بلند شے کو مطلوب) ۱ (ہمارا فکر ہر دم نیا خدا تراشتا رہتا ہے ...ایک الجھن سے نکلتا ہے تو دوسری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے .و مقصود بناتا ہے تو اُس کی اپنی شخصیت بھی

بلند ہوتی ہے‘لیکن جب اس کی نگاہ پستی پر اٹک جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی شخصیت بھی انتہائی پست رہ جاتی ہے. بلند آئیڈیل ہو گا تو اس کی شخصیت کو ترفع حاصل ہو گا. میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو ایک اونچی دیوار پر چڑھنا ہے‘کمند آپ کے پاس ہے تو آپ کو اپنے زورِ بازو کے ذریعے پہلے کمند کو اونچا پھینکنا ہو گا. جتنی اونچی کمند اٹک جائے گی‘ اتنا ہی اونچا آپ جا سکیں گے. جتنا آپ کا آئیڈیل بلند ہو گا‘ اتنی ہی آپ کی شخصیت میں بلندی ہو گی. قرآن مجید میں جہاں فرمایا گیا کہ اہل ایمان کی شان تو یہ ہے کہ شدید ترین محبت اللہ سے کرتے ہیں‘ وہاں انسان کی مجبوری اور پستی کے اندر مبتلا ہونے کا ذکر بھی کیا گیا ہے :

وَ مِنَ النَّاسِ مَن◌ّ یَّتَّخِذُ مِن◌ّ دُو◌ّنِ اللّٰہِ اَن◌ّدَادًا یُّحِبُّو◌ّ نَہُم◌ّ کَحُبِّ اللّٰہِ ◌ؕ وَ الَّذِی◌ّن◌َ اٰمَنُو◌ّ ا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ◌ؕو) البقرۃ:۱۶۵ (

”انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو مد مقابل بنا لیتے ہیں‘ پھر اس سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے‘اور وہ لوگ جو اہل ایمان ہیں وہ شدید ترین ہیں اللہ کی محبت میں“.

محبوبِ حقیقی اللہ کو ہونا چاہیے تھا‘لیکن وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو اس مقام پر کسی اور کو رکھ کر اس کو پوجنا شروع کر دیا‘ اس سے محبت شروع کر دی. یہ انسان کا فطری تقاضا ہے‘ جس کو وہ ہر صورت پورا کرتا ہے‘کسی نہ کسی شے کو اپنا مطلوب و مقصود بنا کر. اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ع”یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!“ (کمند کی تشبیہ میں نے یہیں سے لی ہے.) تمہاری کمند نیچے نہ کہیں اٹک کر رہ جائے‘ اپنی کمندِ آرزو‘ اپنی کمندِ طلب کو اتنا اونچا پھینکو کہ وہ ذات باری تعالیٰ تک تمہیں پہنچا سکے. ع” منزلِ ما کبریا است!“ ہمارا مطلوب و مقصود ذات باری تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں.

ایک غلطی کی اصلاح : یہاں ایک چھوٹا سا نکتہ مزید واضح کر دوں. بعض دینی جماعتوں کے ہاں لفظ ”نصب العین“ غلط طور پر استعمال ہوتا ہے. واضح رہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد ہے‘ اللہ کے دین کی سربلندی کی کوشش ہمارا نصب العین نہیں ہے. دراصل نصب العین صرف اور صرف اللہ اور اس کی رضا ہے. البتہ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کو بجالانا ہے. نماز پڑھنا فرض ہے‘ پڑھنی ہے. روزہ رکھنا فرض ہے‘اس کو رکھنا

ہے. روزہ نصب العین نہیں ہے‘ نصب العی ن اللہ کی رضا ہے. سوائے اللہ کی رضا کے کسی شے کو نصب العین کے درجے میں لانا درست نہیں. اگر کسی درجے میں لانا بھی چاہیں تو ”فلاحِ اُخروی“ کا لفظ استعمال کرلیں. لیکن کسی شے کو فرائض کی فہرست میں سے بلند کر کے نصب العین بنا دینا فکری غلطی ہے‘ اور پھر اس فکر کے نتائج بہت دور رس نکلتے ہیں. اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے‘ اس کی کوشش ہمارے ذمہ ہے‘ تمام شرائط ولوازم کے ساتھ‘ لیکن اقامت دین ہمارا نصب العین نہیں ہے. یہ من جملہ دوسرے فرائضِ دینیہ کے ایک اہم ذمہ داری ہے .

)۳(تقرب الی اللہ :اس سلوکِ قرآنی کا تیسرا مرحلہ تقرب الی اللہ ہے . یہ تقرب الی اللہ کوئی زمانی یامکانی سفر نہیں ہے. صرف یہی ہے کہ جو حجابات طاری ہیں وہ اُٹھتے چلے جائیں اور قربِ معنوی اللہ سے حاصل ہو جائے. یہ فاصلہ زمین پر طے نہیں کرنا ہے‘ یا خلا میں کروڑوں میل جا کر اللہ سے قرب حاصل کرنا اس کا مفہوم نہیں ہے‘ بلکہ یہ ہے کہ انسان کا اللہ کے ساتھ ربطِ معنوی مزید پختہ اور گہرا ہو جائے .

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

ہر انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ہر آرزو اپنے اند کوئی نہ کوئی محبوب رکھتی ہے۔ ہر علم کسی نہ کسی عمل کو آواز دیتا ہے۔ ہر راستہ کسی نہ کسی منزل کی طرف جاتا ہے۔ ہر نظر کسی نہ کسی حسن کی تمنائی ہوتی ہے اور ہر ساعت کسی نہ کسی نغمے کی طلب گار ہوتی ہے اور ان تمام رنگوں کو ہم ایک ہی نام دیں تو وہ ہے " زندگی کا نصب العین "

بے مقصد زندگی ایک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں یا ایک سفر ہے جس کا مقدر در بدر کی رسوائی ہے زندگی وہی ہے جس کے پس پردہ کوئی نہ کوئی لگن ہو، تڑپ ہو، مقصد ہو جس کو زندگی کا نصب العین کہا جاتا ہے۔ اور یہی نصب العین انسان کو سرگرم عمل رکھتا ہے، اسے کام کرنے پر ابھارتا ہے، اس میں جوش و جذبہ پیدا کرتا ہے اور محنت پر ابھارتی ہے جس کی بدولت وہ اپنا نصب العین حاصل کرتا ہے
خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہم اور ہمارا نصب العین: ہمارا پیارا وطن پاکستان ہے جو ہمیں دل و جان سے پیارا ہے اور اسی نسبت سے ہم سب ایک قوم ہیں اور بحثیت ایک قوم کے ہمارا نصب العین بھی ایک ہی ہے اور وہ ہے "ملک و قوم کی بقاء ، سلامتی، ترقی اور خوشحالی " اور اس نصب العین کے حصول کے لئے ہم سب کو خاص کر نوجوانوں اور طلباء کو اہم کردار ادا کرنا چاہیے۔ ہمیں ذاتی اور انفرادی مفادات کو اس نصب العین پر قربان کر دینے چاہے اور اگر ہمارا کوئی ذاتی یا انفرادی مقصدِ زندگی ہے تو اس کے حصول کے لئے بھی یہ سوچ کو تگ و دو کرنی چاہیے کہ اس سے "ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی " میں مدد ملے۔ ہمارے زندگی کا مقصد، ہماری تمام صلاحیتیں، ہماری ہر کاوش اور ہمارا ہر قدم "ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی "

کے لئے ہونا چاہیے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

آ ؤ اپنے جسم چن دیں اینٹ پتھر کی طرح
بے در و دیوار ہے لیکن یہ گھر اپنا تو ہے

اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارا وطن تو بے در و دیوار بھی نہیں ہے ہم اس میں اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں زندگی کی تمام سہولیات، آسائشیں اور سکون اس میں میسر ہے اس لئے ہمارا سب سے اہم اور واحد نصب العین ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی ہونا چاہیے۔ اور اس کے لئے ہمیں رات دن مل کر کوششیں کرنی ہوں گی اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے متفق و متحد ہو کر مشترکہ کاوشیں کرنی ہوں گی اور ہمیں اس کے لئے جانی، مالی اور ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ بقول شاعر

جسم و جان کو جلانا پڑے گا تمھیں
یوں اجالے ملیں گے نہ خیرات میں

ہمارا فرض ہے کہ ہم سب زندگی میں جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، جو کام بھی کر رہے ہوں، جس حالت میں بھی ہوں ہمیں اپنا نصب العین یاد رکھنا چاہئے کیونکہ جو اپنے نصب العین کو بھول جاتے ہیں نامرادی اور ذلت ان کا مقدر بن جاتی ہے اور ان کی حیثیت ایک کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ہو جاتی ہے جسے ہوا کا کوئی جھونکا کسی بھی جانب اڑا یا گرا سکتا ہے۔

رکے جو لوگ تو اک آبجو بھی دریا تھی
اتر گئے تو سمندر بھی تا کمر نکلے

نصب العین کا حصول: کسی بھی انسان کا زندگی کا کوئی بھی نصب العین ہو چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے حصول کے تگ و دو اور محنت کرنا پڑتی ہے ہمیں اپنے پیارے وطن کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی کے لئے کوششیں کرنی چاہیے۔ اپنے نصب العین "ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی" کے حصول

کے لئے ہمیں درج ذیل اقدامات کرنے ہوں گے۔

اتحاد و اتفاق کا فروغ:"ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی" کے حصول کے لئے ہم سب سے پہلے ایک ہونا چاہیے پوری قوم کو متحد اور متفق ہو کر وطن کے لئے کام کرنا چاہئے دین اسلام نے بھی ہمیشہ اتفاق اور اتحاد کا درس دیا ہے اور ہمارے محبوب رہنما قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ہمیشہ اتفاق کا درس دیا ہے ان کے رہنما اصول " تنظیم، اتحاد اور یقین " ہمارے لئے مشعل راہ ہیں ہم موجودہ دور کے چیلنجزوں، خطرات اور دشمنوں کی سازشوں اور ان کے مذموم مقاصد کا مقابلہ صرف اور صرف متحد و متفق ہو کر ہی کر سکتے ہیں اس سلسلے میں ہم سب پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہے کہ ہر شہری اپنی حیثیت، ہمت اور طاقت کے مطابق اپنا اپنا کردار ادا کرے۔ کیو نکہ

افراد کے ہاتھو ں میں ہے ملت کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

تعصبات اور فرقہ واریت کا خاتمہ:"ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی" ہمارا مشترکہ اور واحد نصب العین ہے اور اس کا حصول تب ہی ممکن ہے جب پیارے ملک سے ہر قسم کا تعصبات اور فرقہ واریت ختم ہو جائے۔اس سلسلے میں ہر شہری خاص کر ہم نوجوانوں اور طلباء پر بھاری زمہ داری عائد ہوتی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا کہ "میرے نوجوانوں! میں تمھاری طرف توقع سے دیکھتا ہوں کہ تم پاکستان کے حقیقی پاسبان اور معمار ہو۔دوسروں کے آلہ کار مت بنو،ان کے بہکاوے میں مت آؤ۔ اپنے اندر مکمل اتحاد اور جمیعت پیدا کرو" ہمارے ملک پاکستان کے دشمن اس کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے وہ ہمارے اندر علاقائی، لسانی، نسلی اور مذہبی تعصبات اور فرقہ واریت کو پھیلا کر ہمیں منتشر اور الگ الگ کر نا چاہتے ہیں تا کہ یہ متحد ہو کر عظیم قوم کی صورت اختیار نہ کر سکیں۔

ہمیں اپنے ملک سے ہر قسم کے تعصبات اور فرقہ واریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہو گا مذہبی فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لئے اخوت، بھائی چارے، رواداری، صبر و تحمل اور برداشت جیسے اعلی اقدار کو فروغ دینا

ہو گا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ

لڑتے ہیں اختلاف عقائد پر لوگ کیوں
یہ تو ہے اک معاملہ دل کا خدا کے ساتھ

علاقائی تعصبات کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے ایک شاعر محسن نے یوں کہا کہ

گھن کی صورت یہ تعصب تجھے کھا جائے گا
اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر

خود انحصاری اور خود اعتمادی: اگر ہمیں اپنا نصب العین "ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی" حاصل کرنا ہے اور دنیا میں ایک الگ اور عظیم مقام حاصل کرنا ہے تو اپنے اندر خود انحصاری اور خود اعتمادی پیدا کرنا ہو گی۔ اپنی دنیا آپ پیدا کرنی ہو گی کیونکہ جو لوگ اپنی دنیا آپ پیدا نہیں کرتے، تندرست ہوتے ہوئے بھی بیساکھیوں کے طلب گار ہوتے ہیں دوسروں کی طرف التماس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں غیور اور معزز نہیں کہا جاسکتا۔

سہارا جو کسی کا ڈھونڈتے ہیں بحر ہستی میں
سفینہ ایسے لوگوں کا ہمیشہ ڈوب جاتا ہے

غیرت مند قومیں دوسروں سے مدد نہیں لیتی بلکہ اپنی خاکستر سے بال و پر پیدا کرتی ہیں ان کا عزم بلند ہوتا ہے ان کی اڑان لا انتہا ہوتی ہے وہ آسمانوں کی رفعتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں اور وہ صحراؤں میں باغبانی کی بنیاد رکھتے ہیں نتیجہ اس کوشش کا یہ ہوتا ہے کہ صحرا ان کو راستہ دے دیتے ہیں سمندر ان کا راستہ نہیں روک سکتے اور بلند و بالا پہاڑ ان کے قدموں تلے ریت کے ذرے نظر آتے ہیں

مانگے کی روشنی سے نہ پاؤ گے راستہ
اس تیرگی میں لے کے خود اپنے کنول چلو

اس لئے ہمیں چاہئے کہ اپنے ملک و قوم کی بقاء، سلامتی، ترقی اور خوشحالی کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی مدد آپ کے تحت رات دن کوششیں کریں اپنے وسائل کا درست اور پورا پورا استعمال کریں اللہ تعالی نے ہمارے پیارے وطن عزیز کو دیا کی ہر نعمت سے نوازا ہے اگر ہم محنت، دیانتداری، لگن اور سچے جذبے کے ساتھ کوشش کریں تو ہمارا ملک دنیا کا ایک عظیم ترین ملک بن سکتا ہے اور دوسرے اس کی مدد کرنے کے لئے نہیں بلکہ مدد مانگنے کے لئے اس کی طرف دیکھیں گے -

حرف آخر: میں اپنے مضمون کا اختتام اس بات پر کروں گا کہ اپنے نصب العین کے حصول اور اپنے پیارے وطن کو دنیا میں ایک عظیم ترین ملک بنانے کے لئے ہم سب خاص کر نوجوانوں اور طلباء کو اپنا اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنا چاہئے اور اس کے لئے ذاتی، انفرادی اور اجتماعی طور پر کاوش کرنی چاہئے کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ "انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے" اس لئے ہمیں اپنی طرف سے خلوص نیت اور پوری لگن سے کوشش کرنی چاہئے اور پھر نتیجہ اللہ تعالی پر چھوڑ دینا چاہیے اس شعر پر اختتام کرنا پسند کروں گا۔

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
نتیجہ اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

میری زندگی کا مقصد اور نصب العین بقلم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

All Categories, حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے اردو مضامین وخطبات أبريل 21, 2013 أضف تعليق

] ایک مرتبہ نائر میڈیکل کالج (ممبئی) کے سالانہ میگزین "TONAMEC" کے لیے اس سال کے طالب علم ایڈیٹر ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین صاحب نے مشاہیر ملک و قوم کے نام ایک سوال لکھ بھیجا کہ ازراہ کرم آپ تحریر فرمائیں کہ آپ کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ اس سوال کا جواب لکھ بھیجنے والوں میں دنیا کے مشاہیر شامل تھے، جن میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تھا، حضرت مولانا کا جواب انگریزی میں تھا، جس کا ترجمہ معروف صحافی امین الدین شجاع الدین مرحوم (سابق استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) کے مجموعۂ مضامین "نقوش فکر و عمل" (صفحہ 314-315، طبع اول، مطبوعہ دارین بک ڈپو، ندوہ روڈ، لکھنؤ) کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے۔ عبدالہادی اعظمی ندوی[

"میری زندگی کا مقصد اور نصب العین؛ بلکہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین کائنات کے خالق ومالک کے حضور مکمل خودسپردگی اور تسلیم و نیاز کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے!

میں زندگی کو ایک امانت سمجھتا ہوں، جس کا ہر لمحہ بیش قیمت ہے، دنیا میرے لیے امتحان گاہ ہے اور یہ زندگی ایک آزمائش!

میں اپنے ہر قول و فعل کے لیے خود کو اللہ کے حضور جواب دہ سمجھتا ہوں، جس کے سلسلے میں آخرت میں مجھ سے سوال کیا جائے گا۔

اس لیے میری زندگی کا بنیادی مقصد اپنے رب کی رضا و خوشنودی کا حصول ہے؛ اس کی اطاعت و بندگی کے ذریعہ بھی، اور حقوق العباد کی ادائیگی کی راہ سے بھی، سب کے ساتھ منصفانہ و ہمدردانہ رویہ اور تعاون و خیر خواہی کا جذبہ اپنا کر، اور اپنی مقدور بھر صلاحیت کے مطابق نسل انسانی کی وحدت و مساوات اور اس کی عظمت و حرمت کے لیے جدوجہد کے راستے سے بھی"۔!!!

ہمارانصب العین

پاکستان کو معرض وجود میں لانا مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعے کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں۔ جو ہماری تہذیب وتمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔

)حکومت پاکستان کے افسران سے خطاب 11-اکتوبر 1947ئ(

اردو زبان کا نفاذ، ضرورت و اہمیت

اردو ہماری قومی زبان ہے جو بہت میٹھی اور خوبصورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اچھی اور روانی کے ساتھ اردو بولتا ہو اس کی بات سنتے ہوئے لطف آتا ہے۔ اردو زبان کو ہندوستان کی اصل زبان قرار دیا جاتا ہے جس کی پیدائش ہندوستان میں ہی ہوئی۔ باقی زبانیں تو باہر سے آئی ہوئی ہیں۔ ہندی زبان آریا لے کر آئے، فارسی مغلوں کے ساتھ آئی جبکہ عربی زبان عربوں نے درآمد کی، لیکن اردو زبان نے یہیں جنم لیا اور یہیں پھلی پھولی۔

متحدہ ہندوستان میں اسے مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ سے یہاں کئی بار اردو ہندی تنازعات کھڑے ہوئے، جن کا مقصد ہندی یا اردو میں سے کسی ایک کو ہندوستان میں نافذ کرانا تھا۔ ہندوؤں کا خیال یہ تھا کہ ہندی قدیم زبان ہے جبکہ اردو بعد میں مسلمانوں کے ذریعے آئی۔ حالانکہ چند حقیقت پسند مصنفین کا یہ دعویٰ ہے کہ ہندی زبان ہی دراصل اردو سے نکلی ہے اور انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کا کامیاب تسلسل ہے۔ انہوں نے اردو زبان سے عربی کے الفاظ نکال کر سنسکرت زبان کے چند الفاظ شامل کرکے اسے ہندی زبان کا نام دے دیا، جس کی وجہ سے ہندی اردو تنازعات نے جنم لیا۔ جبکہ اس سے قبل سب اردو زبان ہی بولتے تھے اور ہندوؤں کی اصل زبان سنسکرت تقریباً معدوم ہو چکی تھی۔

اسکول و کالج میں انگریزی کی کتب کی بھرمار ہے۔ ایک مضمون جسے انگریزی کا نام دیا جاتا ہے وہ تو لازمی ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی جس کتاب پر نظر دوڑائی جائے سبھی انگریزی مضمون کی ہی دکھائی دیتی ہیں اور طلبا بھی انہیں انگریزی مضمون ہی تصور کرتے ہیں اور رٹے لگا کر امتحانات میں کامیابی بلکہ زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باقی انہیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اصل میں یہ کتاب کہہ کیا رہی ہے؟ یعنی اصل علم و فن پر توجہ دینے کے بجائے پوری توجہ انگریزی زبان پر صرف کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں حاملین اسناد (ڈگری ہولڈرز) تو بہت ہیں لیکن ماہرین فن نہیں ہیں۔

ترقی کسی زبان کے سیکھنے سے نہیں ہوتی بلکہ ترقی کے لیے علوم و فنون میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ اردو بھی تو ایک زبان ہے لیکن اس کے ماہرین کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اس لیے لوگ اردو کے بجائے انگریزی پر زیادہ

توجہ دیتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزی میں ماسٹرز کی ڈگری کی بہت اہمیت ہے۔ ہمارے تمام امتحانات انگریزی زبان میں ہوتے ہیں۔ کوئی طالب علم کسی علم و فن میں مہارت حاصل کرلے یا کسی دوسری زبان بالخصوص اردو میں ماسٹرز کرلے بلکہ حقیقی معنوں میں "ماسٹر" ہو جائے، لیکن اسے ہر قیمت پر انگریزی زبان میں ماہر ہونا پڑتا ہے۔ اگر وہ انگریزی میں ماہر نہیں تو کوئی امتحان بالخصوص سی ایس ایس وغیرہ جیسے اہم ترین امتحانات پاس کرنا ناممکن ہے۔

پھر انگریزی زبان کا ایسا رعب ہمارے اذہان پر چھایا ہوا ہے کہ ہمیں اردو میں دو چار الفاظ انگریزی کے ملائے بغیر سکون ہی نہیں ملتا۔ بلکہ دوران گفتگو اردو میں انگریزی کے دو چار الفاظ نہ بولنے والے کو پڑھا لکھا ہی نہیں سمجھا جاتا۔ یعنی تمام علوم و فنون میں ماہرین کو خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لیے اردو زبان کو زخمی کرنا پڑتا ہے۔

اگر صرف انگریزی ہی اعلیٰ تعلیم کا معیار ہوتی تو یورپ و امریکا میں ریڑھی بان بھی روانی کے ساتھ انگریزی بولتے ہیں لیکن انہیں تو تعلیم یافتہ خیال نہیں کیا جاتا لیکن ہمارے معاشرے میں علم کا معیار ہی کچھ اور ہے۔ ہمارے کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ اردو زبان میں لچک ہے اور وہ دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرتی ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم خود ہی زبردستی انگریزی کو اس میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال کہ اردو زبان میں لچک ہے، یہ بھی انگریزی کو اردو میں شامل کرنے کی کوشش ہے۔ اگر اسی طرح اردو میں لچک باقی رہی تو پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اردو کی شکل یہ ہوگی کہ تمام الفاظ انگریزی زبان کے ہوں گے اور چند ایک الفاظ اردو کے رہ جائیں گے اور اس اردو ملی انگریزی کو اردو زبان کہا جائے گا۔

انہی غلط خیالات کی وجہ سے ہمارا معاشرہ ترقی پذیر ہے۔ اگر ہم ترقی یافتہ ممالک کی طرف نظر دوڑائیں تو ہم یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انہوں نے اپنی قومی زبان کو ہی اپنایا، اسی میں تعلیم دی۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں ماہرین فن پیدا ہوئے، جنہوں نے ملکی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر ہم بھی ترقی کرنا چاہتے ہیں تو دیگر اہم اقدامات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بہت بڑا قدم ہے کہ ہم انگریزی زبان کو اپنے نظام سے نکال باہر کریں اور زیادہ سے زیادہ اردو زبان کی اشاعت و ترویج کریں۔

انگریزی زبان ایک بین الاقوامی زبان ہونے کے ناتے اہمیت کی حامل ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے اس حد تک استعمال کرنے لگیں کہ اپنی زبان کی تباہی کی بھی پرواہ نہ رہے۔ اس لیے انگریزی کی اہمیت کے پیش نظر اسے صرف ایک مضمون کے طور پر چند ابتدائی درجات میں پڑھایا جائے۔ باقی اگر کسی کو انگریزی سیکھنے کا شوق یا ضرورت ہو تو اس کے لیے الگ سے کورسز کا اہتمام کیا جائے، پوری قوم پر اس کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ تمام نصابی کتب کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے اور اسی کو لازمی قرار دیا جائے۔ دفاتر سے بھی انگریزی کو نکال کر اردو کا نفاذ کیا جائے اور تمام سرکاری کارروائیاں اردو میں ہی انجام پذیر ہونی چاہئیں۔ اسی طرح انگریزی زبان کے الفاظ کو من و عن اردو میں استعمال کرنے کے بجائے ان کا ترجمہ کیا جائے اور اسے قدامت پسندی خیال کرنے کے بجائے حقیقت پسندی سے ترقی یافتہ ممالک کے ان اقدامات کا جائزہ لیا جائے جو انہوں نے اپنی قومی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اٹھائے۔ قومی زبان ہی ملک و قوم کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔

اردو زبان کا نفاذ، ضرورت و اہمیت

اردو ہماری قومی زبان ہے جو بہت میٹھی اور خوبصورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اچھی اور روانی کے ساتھ اردو بولتا ہو اس کی بات سنتے ہوئے لطف آتا ہے۔ اردو زبان کو ہندوستان کی اصل زبان قرار دیا جاتا ہے جس کی پیدائش ہندوستان میں ہی ہوئی۔ باقی زبانیں تو باہر سے آئی ہوئی ہیں۔ ہندی زبان آریا لے کر آئے، فارسی مغلوں کے ساتھ آئی جبکہ عربی زبان عربوں نے درآمد کی، لیکن اردو زبان نے یہیں جنم لیا اور یہیں پھلی پھولی۔ متحدہ ہندوستان میں اسے مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ سے یہاں کئی بار اردو ہندی تنازعات کھڑے ہوئے، جن کا مقصد ہندی یا اردو میں سے کسی ایک کو ہندوستان میں نافذ کرانا تھا۔ ہندوؤں کا خیال یہ تھا کہ ہندی قدیم زبان ہے جبکہ اردو بعد میں مسلمانوں کے ذریعے آئی۔ حالانکہ چند حقیقت پسند مصنفین کا یہ دعویٰ ہے کہ ہندی زبان ہی دراصل اردو سے نکلی ہے اور انگریزوں کی ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ کی پالیسی کا کامیاب تسلسل ہے۔

انہوں نے اردو زبان سے عربی کے الفاظ نکال کر سنسکرت زبان کے چند الفاظ شامل کر کے اسے ہندی زبان کا نام دے دیا، جس کی وجہ سے ہندی اردو تنازعات نے جنم لیا۔ جبکہ اس سے قبل سب اردو زبان ہی بولتے تھے اور ہندوؤں کی اصل زبان سنسکرت تقریباً معدوم ہو چکی تھی۔ کئی صدیاں اکٹھے رہنے کے بعد مسلمانوں نے جب ہندوؤں کے تیور بدلے ہوئے دیکھے تو انہوں نے اپنے مذہب، اپنی ثقافت، اپنی زبان کو ترقی دینے کے لیے الگ وطن حاصل کیا، جو آج ایک عظیم ملک پاکستان کی صورت میں نعمت خداوندی کے طور پر ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے یہاں اپنے مذہب و ثقافت کے ساتھ جو حال کیا اس سے کہیں

برا حال اپنی قومی زبان اردو کے ساتھ کیا۔ ہم نے ملک میں اردو کے بجائے انگریزی زبان نافذ کر دی اور گزشتہ تہتر سال سے یہی زبان نافذ ہے۔ سرکاری و پرائیویٹ دفاتر، تعلیمی ادارے اور عوامی مقامات انگریزی زبان سے ہی بھرپور ہیں۔ اردو زبان ہر بچہ معاشرے سے سیکھ لیتا ہے، اس کے بعد اسے انگریزی سیکھنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔

اگر اس کے سیکھنے میں کچھ کمی رہ جائے یا نہ سیکھ پائے تو اس کے لیے جینا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ملک میں تو ہر جگہ انگریزی کا راج ہے اردو زبان کو پوچھتا ہی کون ہے؟ وہ جیسی کیسی بھی بول یا سمجھ لی تو کام چل جاتا ہے لیکن انگریزی میں کسی قسم کی کمی پائی گئی تو کتنا ہی محب وطن کیوں نہ ہو راندہ درگاہ ہو جاتا ہے۔ اس کی کہیں جگہ نہیں رہتی۔ دفاتر میں جائے تو وہاں انگریزی میں خطوط پکڑا دیے جاتے ہیں جنہیں پڑھنے اور سمجھانے کے لیے انگریزی دان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عوامی مقامات پر انگریزی اشارات پر مشتمل بورڈ لگے ہوتے ہیں جنہیں ایک ناخواندہ یا کم تعلیم یافتہ شخص کے لیے پڑھنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ اسکول و کالج میں انگریزی کی کتب کی بھرمار ہے۔ ایک مضمون جسے انگریزی کا نام دیا جاتا ہے وہ تو لازمی ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی جس کتاب پر نظر دوڑائی جائے سبھی انگریزی مضمون کی ہی دکھائی دیتی ہیں اور طلبا بھی انہیں انگریزی مضمون ہی تصور کرتے ہیں اور رٹے لگا کر امتحانات میں کامیابی بلکہ زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

باقی انہیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اصل میں یہ کتاب کہہ کیا رہی ہے؟ یعنی اصل علم و فن پر توجہ دینے کے بجائے پوری توجہ انگریزی زبان پر صرف کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں حاملین اسناد (ڈگری ہولڈرز) تو بہت ہیں لیکن ماہرین فن نہیں ہیں۔ ترقی کسی زبان کے سیکھنے سے نہیں ہوتی بلکہ ترقی کے لیے علوم و فنون میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ اردو بھی تو ایک زبان ہے لیکن اس کے ماہرین کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اس لیے لوگ اردو کے بجائے انگریزی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزی میں ماسٹرز کی ڈگری کی بہت اہمیت ہے۔ ہمارے تمام امتحانات انگریزی زبان میں ہوتے ہیں۔ کوئی طالب علم کسی علم و فن میں مہارت حاصل کر لے یا کسی دوسری زبان بالخصوص اردو میں ماسٹرز کر لے بلکہ حقیقی معنوں میں "ماسٹر" ہو جائے، لیکن اسے ہر قیمت پر انگریزی زبان میں ماہر ہونا پڑتا ہے۔ اگر وہ انگریزی میں ماہر نہیں تو کوئی امتحان بالخصوص سی ایس ایس وغیرہ جیسے اہم ترین امتحانات پاس کرنا ناممکن ہے۔

پھر انگریزی زبان کا ایسا رعب ہمارے اذہان پر چھایا ہوا ہے کہ ہمیں اردو میں دو چار الفاظ انگریزی کے ملائے بغیر سکون ہی نہیں ملتا۔ بلکہ دوران گفتگو اردو میں انگریزی کے دو چار الفاظ نہ بولنے والے کو پڑھا لکھا ہی نہیں سمجھا جاتا۔ یعنی تمام علوم و فنون میں ماہرین کو خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لیے اردو زبان کو زخمی کرنا پڑتا ہے۔ اگر صرف انگریزی ہی اعلیٰ تعلیم کا معیار ہوتی تو یورپ و امریکا میں ریڑھی بان بھی روانی کے ساتھ انگریزی بولتے ہیں لیکن انہیں تو تعلیم یافتہ خیال نہیں کیا جاتا لیکن ہمارے معاشرے میں علم کا معیار ہی کچھ اور ہے۔ ہمارے کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ اردو زبان میں لچک ہے اور وہ دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرتی ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا ہر گز نہیں ہے بلکہ ہم خود ہی زبردستی انگریزی کو اس میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال کہ اردو زبان میں لچک ہے، یہ بھی انگریزی کو اردو میں شامل کرنے کی کوشش ہے۔

اگر اسی طرح اردو میں لچک باقی رہی تو پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اردو کی شکل یہ ہو گی کہ تمام الفاظ انگریزی زبان کے ہوں گے اور چند ایک الفاظ اردو کے رہ جائیں گے اور اس اردو ملی انگریزی کو اردو زبان کہا جائے گا۔ انہی غلط خیالات کی وجہ سے ہمارا معاشرہ ترقی پذیر ہے۔ اگر ہم ترقی یافتہ ممالک کی طرف نظر دوڑائیں تو ہم یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انہوں نے اپنی قومی زبان کو ہی اپنایا، اسی میں تعلیم دی۔

جس کی وجہ سے ان کے ہاں ماہرین فن پیدا ہوئے، جنہوں نے ملکی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر ہم بھی ترقی کرنا چاہتے ہیں تو دیگر اہم اقدامات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بہت بڑا قدم ہے کہ ہم انگریزی زبان کو اپنے نظام سے نکال باہر کریں اور زیادہ سے زیادہ اردو زبان کی اشاعت و ترویج کریں۔

انگریزی زبان ایک بین الاقوامی زبان ہونے کے ناتے اہمیت کی حامل ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے اس حد تک استعمال کرنے لگیں کہ اپنی زبان کی تباہی کی بھی پرواہ نہ رہے۔ اس لیے انگریزی کی اہمیت کے پیش نظر اسے صرف ایک مضمون کے طور پر چند ابتدائی درجات میں پڑھایا جائے۔ باقی اگر کسی کو انگریزی سیکھنے کا شوق یا ضرورت ہو تو اس کے لیے الگ سے کورسز کا اہتمام کیا جائے، پوری قوم پر اس کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ تمام نصابی کتب کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے اور اسی کو لازمی قرار دیا جائے۔ دفاتر سے بھی انگریزی کو نکال کر اردو کا نفاذ کیا جائے اور تمام سرکاری کارروائیاں اردو میں ہی انجام پذیر ہونی چاہئیں۔ اسی طرح انگریزی زبان کے الفاظ کو من و عن اردو میں استعمال کرنے کے بجائے ان کا ترجمہ کیا جائے اور اسے قدامت پسندی خیال کرنے کے بجائے حقیقت پسندی سے ترقی یافتہ ممالک کے ان اقدامات کا جائزہ لیا جائے جو انہوں نے اپنی قومی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اٹھائے۔ قومی زبان ہی ملک و قوم کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔

ضیاالرحمٰن ضیا

بشکریہ ایکسپریس نیوز

اردوزبان کی اہمیت وافادیت

اردوزبان پاکستان کی جان ہے۔ اردو نے قیام پاکستان میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ ہندوستان میں سرسید کی سیاسی اور تعلیمی جدوجہد کی بنیاد "ہندو مسلم اتحاد" تھا۔ ان کا موقف تھا کہ اگر ہندو مسلم متحد ہو کر انگریز سرکار کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو انگریز کو "من مانی" کا موقع نہیں ملے گا۔ اتحاد میں برکت ہے، افتراق میں انتشار ہے۔ اردوزبان کی جنم بھومی ہندوستان ہے۔ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان رابطہ کی زبان تھی۔ اسے مسلمان، ہندو اور دیگر ہندی اقوام بخوبی جانتے اور بولتے تھے۔ سرسید احمد خان کے زمانے میں ہندو نے مسلم دشمنی کا پہلا ہدف اردوزبان کو بنایا اور کہا کہ مسلمان بدیسی ہیں۔ اردو مسلمانوں کی زبان ہے لہٰذا ہندو قوم اردوزبان استعمال نہ کرے بلکہ ہندی بولے اور لکھے۔ انگریز حکومت نے ہندی زبان کی سرپرستی کی اور ہندوستان سے پہلے فارسی کو نکالا اور اب اردو کے درپے ہو گئے۔ زبان کا معاملہ سادہ اور آسان نہیں۔ مسلمان اردو بولنے، لکھنے اور سمجھنے سے محروم ہو گئے تو مسلمان اپنی تاریخ، تہذیب و تمدن اور رسم ورواج سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کے سامنے اچھوت اقوام کی مثال تھی۔ اچھوت ہندوستان کے اصلی نسلی باشندے اور حکمران تھے۔ جب برہمن قوم نے اچھوتوں کو شکست دی تو ان کو ان کے شاندار ماضی سے کاٹنے کے لیے ان کی مقامی زبان متروک کر دی اور آج ہندوستان میں اچھوت اقوام کی تعداد کروڑوں میں ہے مگر ان کا تاریخی ورثہ متروکہ زبان میں کھو گیا۔ اچھوتوں کو غلامی کی تاریخ تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ مگر وہ تاریخی ورثہ اور اپنی قومی زبان سے محرومی کے باعث ماضی سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو برہمن اور یہودی دنیا کی وہ قومیں ہیں جو سیاسی وریاستی اہمیت کھو چکی تھیں مگر انہوں نے اپنی قومی اور قدیم زبانوں یعنی ہندی اور عبرانی زبانوں کو اپنے گھروں میں زندہ رکھا اور جب ہندو بھارت اور صیہونی اسرائیل ریاستیں قائم ہوئیں تو انہوں نے ہندی کو بھارت کی قومی اور عبرانی کو اسرائیل کی قومی و سرکاری زبان بنا دیا اور آج یہ دونوں متروکہ زبانیں سرکاری اور ریاستی سرپرستی کے سبب زندہ زبانیں بن گئی ہیں۔

الحمد للہ تحریک پاکستان کی قیادت اور مسلمان عوام نے اردوزبان کے خلاف ہندو اور انگریز کی متحدہ پالیسی کے خطرات کو سمجھا اور سدباب کیا۔ سرسید احمد خان کی زندگی میں اردوزبان کے تحفظ کے لیے کمیٹی بنی اور بھرپور کام کیا۔ پہلے سرسید احمد خان، بعد ازاں محسن الملک اور وقار الملک اردوزبان کے تحفظ کمیٹی کے

سربراہ رہے۔ ایک موقع پر انگریزی سرکار نے حکم صادر کیا کہ علی گڑھ سکول، کالج کی صدارت اور اردو زبان کی حفاظت کو ترجیح دی گئی اور یہی اردو زبان کی حفاظت کا احساس تھا جس نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ گو مسلم لیگ کے قیام کا فوری سبب تقسیم بنگال کے ثمرات سے مسلم آبادی کو فائدہ پہنچانا تھا۔ مگر مسلم لیگ کے بنیادی اہداف اور منشور میں اردو زبان کا تحفظ شامل تھا اور یہی سبب تھا کہ قائد اعظم نے قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کو پاکستان کی قومی و سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ بد قسمتی سے قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد اس ضمن میں غفلت برتی گئی اور آج یہ دانستہ غفلت ایک عذاب بن کر چھائی ہوئی ہے۔ گو پاکستان کی عدالت عظمیٰ نے کئی بار نفاذ اردو کے احکام جاری کیے ہیں جو حیلے بہانے اور تاویل کا شکار کر دیے جاتے ہیں۔ زبان کی اہمیت اور افادیت کے دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو الفاظ، حروف اور دوسرا پہلو رسم الخط ہے۔ اگر زبان کے حروف اور رسم الخط کی حفاظت نہ کی جائے تو زبان ختم ہو جاتی ہے۔ رسم الخط کی اہمیت سے دشمن بخوبی آشنا ہے۔ گاندھی کہا کرتا تھا کہ ہمیں اردو پسند ہے، ہم اردو بولتے ہیں، اردو نے ہندوستان میں جنم لیا۔ ہمیں اردو سے پیار ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو رسم الخط قرآنی نہیں ہونا چاہیے، اگر اردو زبان کا رسم الخط ہندی اور سنسکرت میں ہو جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اردو زبان کا قرآنی رسم الخط مسلمانوں کو قرآن سے قریب کرتا ہے اور قرآن بدیسی ہے، دیسی نہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران مسلمان قیادت اور عوام نے اردو زبان کی ابجد اور رسم الخط کی بھرپور حفاظت کی مگر آج پاکستانی قوم کا یہ حال ہے کہ وہ اردو زبان کو انگریزی رسم الخط میں لکھ رہے ہیں۔ اس وقت اردو زبان پاکستان کے اندر اجنبی زبان بنتی جا رہی ہے۔ ہماری نئی نسل کا ذریعہ تعلیم انگریزی بنا دیا گیا ہے۔ انگریزی زبان کو تعلیم و تربیت کی کنجی سمجھا جا رہا ہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ عام اشتہار انگریزی رسم الخط میں لکھے ہوتے ہیں۔ اگر اردو زبان کی گرتی ہوئی صورتحال کو روکا نہیں گیا تو پاکستان کے اندر حالت یہ ہو جائے گی کہ ہم اپنے شاندار ماضی سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ ہماری تاریخ، تہذیب اور تربیت کی روایت بھی ختم ہو جائے گی۔ تحریک پاکستان کا سارا سرمایہ اردو زبان میں ہے۔ اگر ہمارے پاس اردو نہ رہی تو ہمارے پاس ہماری تاریخ بھی نہیں رہے گی۔ قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ، سر سید احمد خان، شاہ ولی اللہ، شاہ عبد الرحیم اور سارا اردو ادب ہمارے لیے اجنبی ہو جائے گا۔ اس ضمن میں ہم سے بہتر تو ہندو اور یہودی قوم ہے جس نے اپنی نئی

نسل کو ہندی اور عبرانی زبان میں تعلیم و تربیت دی اور اس طرح مردہ زبان کو زندہ کیا ہے اور ہم اپنی دانستہ اور غیر دانستہ غفلت کے باعث زندہ زبان کو مردہ بنانے میں مصروف ہیں۔ قائداعظمؒ ایک مدبر سیاستدان تھے۔ انہوں نے اردو کو قومی زبان قرار دیا تھا، ہمیں ملک کے اندر اردو زبان کے نفاذ کے لیے مخلصانہ کوششوں سے دستبرداری نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری علمی، ادبی اور تحقیقی زبان اردو ہے۔ ہمیں اردو زبان اور اردو رسم الخط کا تحفظ قومی مقاصد میں شامل رکھنا چاہیے۔

اردو زبان کی اہمیت

روایت؛

اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جس نے مختلف قوموں میں رابطے کی زبان کا کردار ادا کیا۔اردو زبان کی ارتقاء کے بارے دیکھا جائے تو اس کو اولیاء کی زبان کہا جاتا ہے۔دکن میں اس کو دکنی، گوجرہ میں گوجری اور ہندوستان میں اسے ہندی یا پھر ہندوی بھی کہا جاتا تھا۔اس کے قدیم ناموں میں ریختہ، اردوئے معلیٰ اور پھر لشکری زبان کے نام سے جانا جانے لگا۔

معنی و مفہوم؛

اردو زبان رابطے کی زبان ہے۔یہ لفظ ترکی زبان سے ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔اس زبان کو لشکری زبان اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ ہندوستان میں کئی طرز کی عوام آتی تھی تو آپس میں ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کے لیے اپنی آبائی زبان کے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے اور یوں مقامی لوگوں کے الفاظ بھی اپنی زبان میں داخل کرتے رہتے۔اور پھر ایک بڑی زبان کا وقوع ہوا جو آج دنیا کی تیسری بڑی زبان مانی جاتی ہے۔

نظریات؛

اردو کے وقوع کے متعلق مختلف لوگوں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔مہاتما گاندھی کا کہنا ہے کہ اردو زبان قرآن کے حروف کی زبان ہے۔حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف پنجاب میں اردو میں کہا ہے کہ اردو زبان کا اصل ماخذ پنجابی زبان ہے۔اسی طرح دکن میں اردو میں نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے کہ اردو زبان کی بنیاد دکن ہے۔سندھی زبان میں لکھی گئی تصنیف کے مصنف کا کہنا ہے کہ اردو زبان اصل میں سندھی سے ہے۔لیکن اگر مکمل تاریخ کو دیکھا جائے تو اردو زبان کی اصل جڑ اولیاء کے وہ رسائل ہیں جو

اس دور میں تبلیغ کا ذریعہ بنے تھے۔

ضرورت اور اہمیت؛

اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔اور پاکستان کی قومی زبان ہے۔ 1973 کے آئین کے تحت شق 251 کے مطابق اردو کو دفتری زبان بنانے کا اعلان ہوا مگر افسوس کہ آج تک اس پر عمل درآمد نہ ہوا۔ اردو زبان کی آج کے دور میں ملک کے بڑھتے بچوں کو بہت ضرورت ہے کیونکہ وہ تعلیم ہی اثر رکھتی ہے جو انسان اپنی قومی زبان میں حاصل ہوتا ہے اس سے یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو غیر زبان سیکھنے میں جو وقت برباد کرنا پڑتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کی نئ نسل کو اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی آپشن دینی چاہیئے۔ کیونکہ اپنی زبان سے دوری ہماری نسل کو دین سے بھی دور کر رہی ہے۔ غیر زبان کی لپیٹ میں اردو لکھنا اور بولنا نئے بچوں کے لیے کسی محاز سے کم نہیں رہا۔ پاکستان اپنی قومی زبان میں بھی ترقی کر سکتا ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکتا ہے جس طرح چین نے کیا

زبان کی اہمیت

SYED MAZHAR نومبر 21,2018 LEAVE A COMMENT

ابتدائی تعلیم میں زبان کی بنیادی اہمیت اور بچے کی اس پر مہارت عموما تسلیم شدہ ہے۔ اس عمومی قبولیت کی وجہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زبان بچوں کے لئے اور ہر کسی کے لئے ایک دوسرے سے رابطہ کا جز ولاینفک ہے۔ کیا لسانی علم علم ریاضی، سائنس یا کسی اور مضمون کے فہم کے لئے لازم ہے؟ بلاشبہ بچے تعلیم کے تمام مضامین زبان ہی کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بے شک بچے زبان کے ساتھ اور زبان کے ذریعے ہی سوچتے ہیں، فیصلے کرتے ہیں اور اقدام کرتے ہیں۔ سماج کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے بچے کے وجود میں زبان مرکزی کردار ادا کرتی ہے (جیسے کسی اور کے معاملے میں)۔

بچے کی تعلیم اور ترقی کے لئے زبان کی مرکزیت کو قبول کرنے کیلئے مذکورہ بالا نقطہ نظر کا واضح ہونا نہ صرف ضروری بلکہ لازم ہے۔ بہر حال یہ ایک محدود نقطہ نظر ہے۔ اس نقطہ نظر کی محدودیت زبان کو

ایک آلہ کی حیثیت سے دیکھنے میں ہے، علم ریاضی کو سمجھنے یا فیصلہ لینے کا آلہ۔ بلاشبہ زبان ایک آلہ ہو سکتی ہے لیکن یہ اسکے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ "بہت کچھ" ہی شاید بچوں کی تعلیم اور انکی تمام تر زندگی میں زبان کی مرکزیت کو قطعیت بخشتا ہے۔

ہم انسان اپنے اطراف کی دنیا کو نہ صرف دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں بلکہ انہیں معنی بھی دیتے ہیں۔ لہذا جب میں برسات کے موسم میں کالے بادلوں کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر صرف انکی بناوٹ کا اثر نہیں ہوتا بلکہ ایک پیچیدہ اور مضبوط اثر کالے بادلوں اور بارش، رقص کرتے مور اور بھیگے کپڑوں کی بیچینی کے درمیان تعلق بنانے سے ہوتا ہے۔ اگر میں یہ تعلق نہ بناؤں تو کالے بادل میرے لئے کوئی معنی نہی رکھتے، وہ مجھ پر کچھ اثر نہیں کرتے بلکہ محض یہ ایک بناوٹ رہ جاتی ہے جس کا مجھے ادراک ہوا۔

یہی وہ "تعلق پیدہ کرنیوالا عمل ہے جو دنیا کی ہر چیز کو معنی دیتا ہے۔ یہ معنی ہی کی آمیزش ہے جو چیزوں کی حیثیت کو بدل دیتی ہے (خصوصاً ہمارے شعور میں) "صرف ہونے" سے "معنی خیز ہونے" کی طرف۔ چیزوں کو معنی ہم اپنے تصورات سے فراہم کرتے ہیں۔ ان تصورات کو ترقی دینے کیلیئے ہم اپنے ذہن میں کچھ نشانیاں بناتے ہیں اوران تصورات اور نشانیوں کے درمیان تعلق بناتے ہیں۔ ان نشانیوں پر ذہنی سرگرمی اس تعمیر کا عمل ہے۔

اس ذہنی سرگرمی کی بنیاد زبان ہے اور یہ درحقیقت اس پورے تعمیراتی عمل کا غیر منقسم اور لازمی جز ہے جو انسان کے تصور کی تعمیر کو فروغ دیتا ہے۔

تصور کا نام رکھے بغیر یہ پورا عمل ناممکن ہے۔ یہ نام زبان میں الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تصور کی تعمیر اور ترقی ہی دراصل شعور اور سمجھ کی ترقی اور حصول ہے۔ زبان اور شعور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ایک کا وجود دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔

زبان محض ایک آلہ ہی نہیں ہے۔ یہ شعور کا ایک لازمی اور ناگزیر حصہ ہے۔ یہ انسانی ذہن اور خود شعوری کی لیاقت ہے۔ انسانی ذہن شعور کی مجموعیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ شعور کی ترقی کے ساتھ ترقی کرتی ہے اور جب شعور پر روک لگائی جاتی ہے تو زبان بھی رک جاتی ہے۔ یہ خلاصہ ابتدائی تعلیم کیلیئے نہایت اہم ہے۔

زبان اور شعور کی ترقی کے کچھ مرحلوں کے بعد یہ ممکن ہے کہ دونوں کی بنیاد اس حد تک مکمل ہو چکی ہو کہ شعور زبان کی ہمروی کے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن ہو یا بالعکس۔ لیکن یہ تقسیم بلاشبہ ابتدائی تعلیم کی سطح پر ناممکن ہے۔ ابتدائی تعلیمی سطح پر زبان اور شعور کی ترقی بچوں کے ذہنی ارتقاء کے دو لازمی اور ناگزیر پہلو ہیں۔

آیئے زبان کے کچھ پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں۔ بول چال کی زبان کی بنیادی اکائی لفظ ہے۔ لفظ آوازوں کا مجموعہ ہے۔ اگر اس آوازوں کے مجموعہ کو تصور سے مربوط نہ کیا جائے تو یہ محض ایک بے معنی آوازوں کا مجموعہ رہ جاتا ہے اور لفظ نہیں بنتا۔ ایک مخصوص آوازوں کے مجموعہ (لفظ) کو کسی مخصوص تصور سے مربوط کرنے کے کوئی منطقی اصول و ضوابط نہیں ہیں۔ یہ ربط بے قاعدہ ہے۔ یہ یقینی بے قاعدہ ربط کسی مخصوص زبان استعمال کرنے والے میں مستحکم اور عالمگیر ہے۔ "درخت" چند آوازوں کا مجموعہ ہے جو ایک مخصوص تصور سے مربوط ہے، اور یہ رشتہ مستحکم ہے۔ اگر چہ کہ یہ کچھ دوسرے آوازوں کے مجموعے کی طرح نہیں ہے جو کچھ دیر بعد تصور سے رشتہ جوڑنا شروع کر دے۔ مثلاً کل کچھ اور آوازوں کا مجموعہ، "کرکٹ" آج کے "درخت" کے تصور سے رابطہ نہیں بناتا حالانکہ درخت کا تصور سے تعلق ویسے ہی بے قاعدہ ہے جیسے کے کرکٹ کا۔

با معنی زبان کو بنانے کے لئے الفاظ کچھ قواعد و ضوابط کے ساتھ (یا ذریعے) مستعمل ہوتے ہیں۔ مثلاً الفاظ کا تسلسل ایک مناسب معنی بنانے کے لئے کچھ اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ یہ اصول بھی بے قاعدہ ہوتے ہیں لیکن مستحکم اور عالمگیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا زبان قواعد و ضوابط کے تحت قولی نشانیوں کا ایک نظام ہے جس سے انسان معنی اور مطالب بناتا ہے۔ یہ نظام بہت ہی منظم ہے اور سراسر انسان کا بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ کسی بھی زبان میں آوازوں کے مجموعوں کی تعداد محدود ہے، معنی اور مطالب کی تعمیر کے لئے زبانی نظام کی قابلیت لامحدود ہے۔

زبان سیکھنا دراصل اس نظام کی مہارت حاصل کرنا اور اسے معنی کی تشکیل، مطالب کے حصول اور معنی کے اظہار کیلئے استعمال کرنا ہے۔

بول چال کی زبان قولی علامتوں سے بنتی ہے۔ اور تحریری زبان بصری علامتوں سے یا کسی سطح پر نشانیاں لگا کر بنتی ہے۔ یہ نشانیاں حروف ہوتے ہیں۔ حروف کی شکلیں (یا ان کے مجموعے) آوازوں کی نمائندگی

کرتے ہیں۔ ان نشانیوں کا آوازوں سے رشتہ بھی بے قاعدہ ہے لیکن مستحکم اور عالمگیر ہے۔ ہم ہمیشہ (ذہنی طور پر) لکھی ہوئی زبان کا بیانی زبان میں "ترجمہ" کرتے ہیں اور پھر اس سے معنی اخذ کرتے ہیں۔ لہذا بیانی زبان کے تقابل میں تحریری زبان کے ذریعہ معنی تک پہنچنے کے مراحل زیادہ ہیں۔

بیانی زبان کے عمل میں "غیر زبانی گفتگو" کی گنجائش اور موقعہ ہوتا ہے (مثلاً کسی کے چہرے پر آنے والے آثار اور ہاتھ کے اشارے وغیرہ) اور فوراً صفائی کی گنجائش بھی موجود رہتی ہے۔ یہ عموماً تحریری زبان میں ممکن نہیں ہے۔ لہذا تحریری زبان کچھ اضافی علامتوں کا استعمال بھی کرتی ہے اور ایک سخت ضابطہ کی پابندی بھی کرتی ہے۔

اس مختصر مضمون کا مقصد لسانیاتی تجزیہ نہیں ہے بلکہ کچھ ایسے مسائل پر گفتگو کرنا ہے جن کا بالواسطہ تعلق ابتدائی سطح میں تعلیم و تعلم سے ہے۔ چند نتائج جو ہم نے اس مضمون سے اخذ کئے ہیں درج ذیل ہیں۔

1 ۔ بچوں کیلئے شعور اور زبان کی ترقی ایکدوسرے پر منحصر ہے۔

2 ۔ تصور اور آوازوں کے مجموعے (لفظ) کا رشتہ بے قاعدہ ہے اور اس کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔ لیکن یہ رشتہ عالمگیر اور مستحکم ہے۔

3 ۔ الفاظ کو جملے بنانے اور معنی کی تشکیل میں استعمالکرنے کے قواعد و ضوابط بھی بیقاعدہ ہیں لیکن یہ بھی مستحکم اور عالمگیر ہیں۔

4 ۔ لہذا زبان ایک منظم علاماتی نظام ہے۔

5 ۔ معنی کی تعمیر کے لئے لسانی نظام کی قابلیت لامحدود ہے۔

6 ۔ تحریری زبان میں حروف آوازوں کے مجموعوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان سے تعلق بھی بناتے ہیں۔

7 ۔ بیانی زبان کے تقابل تحریری زبان کے ذریعہ معنی تک پہنچنے میں زیادہ مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔

ابتدائی سطح میں تعلیم و تعلم کے سلسلے میں اخذ کردہ درج بالا نتائج کے مضمرات میں سے دو کی طرف فوری اشارئے پیش ہیں۔ جو بیقاعدہ ہے وہ بچہ سے تنہا قائم نہیں ہو سکتا۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ دوسری زبان بولنے والوں کا مشاہدہ کیا جائے، ان لوگوں سے مدد لی جائے جو ان بیقاعدہ رشتوں کو بنانے میں مہارت

رکھتے ہوں اور لازماً مشق کی جائے پھر کہیں جا کر یہ مشق تصوراتی سمجھ پر سبقت لیتی ہے۔ قواعد و ضوابط میں بندھے نظام پر اسی وقت مہارت حاصل کی جاسکتی ہے جب بچہ کی تصوراتی مشغولیت اور ذہنی سمجھ مشق پر سبقت لے جائے۔ زبان سیکھنے کیلئے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے حالانکہ مجموعی طور پر سیکھنے کے عمل میں تصوراتی سمجھ اور معنی سازی اہم کردار نبھاتے ہیں لیکن مشق کو ہم رعایت نہیں دے سکتے، خصوصاً تحریری مہارت کے حصول میں۔

اس چھوٹے مضمون میں کچھ متنازع دعوے بھی کئے گئے ہیں؛ ان بارے میں وضاحت پیش ہے۔ اس بات کا دعوی کیا گیا ہے کہ الفاظ بیترتیب انداز میں آوازوں کا مجموعہ ہیں۔ اس پر کافی لسانی تحقیق ہو چکی ہے کہ الفاظ کی تشکیل کیلئے آوازوں کو چند طے شدہ عالمگیر ضوابط کے مطابق جمع کیا جاتا ہے۔ لیکن ان اصولوں کی پابندی کے باوجود الفاظ کی غیر معمولی اکثریت آوازوں کے جمع کرنے میں بے قاعدگی کو برقرار رکھتی ہے اور تصور کو ان آوازوں سے جوڑنے میں حتمی طور پر۔ دوسرا دعوی لفظ کو زبان کی معنی خیز اکائی بنانے کا ہے۔ یہ غلب خیال ہے کہ زبان کی کعنی خیز اکائی جملہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معلومات کے اظہار، درخواست اور سوال وغیرہ کیلئے اکائی جملہ ہے لیکن ذہن میں خیال کی جنبش پیدہ کرنے کیلئے ایک لفظ ہی کافی ہے۔ اور خیال کی جنبش لازماً معنی خیز ہوتی ہے۔

تیسرا دعوی جملوں میں الفاظ کی ترتیب کی آمریت کا ہے۔ لسانیاتی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام انسانی زبانوں میں جملوں میں الفاظ کی ترتیب عالمگیر ضوابط پر ہوتی ہے۔ اس بات کا دعوی بھی کیا جاتا ہے کہ بچے اس ترتیب میں کبھی غلطی نہیں کرتے اور یہ ضوابط انسانی ذہن میں فطری طور پر نقش ہیں۔ چونکہ ایک سے زیادہ ساخت پر جملوں کو لکھا جا سکتا اور بچے غلطی کرتے ہیں اسلئے ان ضوابط کو سیکھنے کیلئے تجربہ کی ضرورت ہے۔ جی ہاں، بہت سارے عالمگیر ضوابط ہیں، لیکن یہ ایک متنازع نکتہ ہے کہ وہ فطری طور پر مخصوص لسانی ضوابط ہیں یا انسان کے شعوری آہنگ کا اظہار ہیں۔ لہذا یہاں آمریت محدود ہے۔

کئی جگہوں پر آوازوں کے مجموعہ اور معنی وغیرہ کو لسانی دائرہ میں مستحکم اور عالمگیر قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک خاص عرصہ اور سمجھ کیلئے محدود ہیں۔ زبانیں اپنے انداز اور الفاظ کے معنی بدلتی ہیں وقت اور استعمال کرنیوالوں کے درمیان۔ لیکن جب تک یہ عام فہم ہوتے ہیں ان کا مقبول عام ہونا اور مستحکم ہونے کا کردار جاری رہتا ہے۔

اختتام میں: انسان بننے کیلیئے زبان کا مقام مرکزی ہے۔ یہاں اس پہلو کو تفصیلاً نہیں بیان کیا گیا ہے۔ ایک وجہ جگہ کی قلت ہے اور دوسری وجہ در اصل یہاں ان نکتوں کی نشاندہی کرنا مقصود ہے فوری طور پر کلاس روم میں زبان کی تعلیم کیلیئے استعمال ہو سکتے ہیں۔

اردو زبان کی تعلیمی اہمیت!!

اقوام عالم میں اس قوم کو غریب الدیار تصور کیا جاتا ہے جو اپنی قومی زبان سے محروم ہو اور کسی دوسری قوم سے مستعار شدہ یا ادھار لی جانیوالی زبان سے گزارہ کر رہے ہوں جیسے برطانوی انگریزی زبان کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جسے امریکیوں نے اس وقت اختیار کیا جب تاج برطانیہ نے کچھ عرصہ امریکہ پر حکومت کی۔ برطانیہ کے امریکہ سے نکل جانے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے امریکی انگریزی کو قومی زبان قرار دیا چونکہ اتحاد سے قبل بیشتر امریکی ریاستوں میں لاطینی، فلپائنو، پرتگیزی و دیگر زبانیں بولی جاتی تھیں۔ امریکیوں نے غیر ملکی برطانوی زبان انگریزی اختیار کرنے کے خفت کو مٹانے کیلیئے انگلش زبان میں ملاوٹ شروع کر دی اور الفاظ کے سپیلنگز اور معنی کو بدلنے کی کوشش کی تاکہ امریکی انگریزی کی انفرادیت برقرار رہ سکے۔ جو سوائے چوری کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی طرح ہماری زبان اردو جسے لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے اپنے اسلوب، انداز، فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے دنیا کی چند زبانوں میں سے ایک ہے۔ جیسے آج بھارت نے سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بولنے اور سمجھنے میں اردو کو اختیار تو کر رکھا ہے لیکن اسے ہندی کا نام دیکر مکاری اور عیاری سے کام لے رہا ہے۔ خالصتاً سنسکرت کی بات کی جائے تو آج کے 80٪ بھارتی شہری اسے سمجھنے سے قاصر ہیں اور جو ان کے اوپر سے گزر جاتی ہے اور اس بات کی تائید اور اقرار ہندوستان کے نامور ادیب اور ہندو ادبی بورڈ کے سابقہ چیئرمین اوپی نارنگ نے تقریباً دس سال قبل ایک پاکستانی روزنامہ کو انٹرویو دیتے ہوے کیا جو کسی بھی سند سے کم نہیں ہے۔ اس پس منظر کے تحت اگر اردو زبان کی بات کی جائے تو ہم پاکستانی ایک امیر قوم ہیں اور آج اردو جنوبی ایشیا اور بہت سی عرب ریاستوں میں سب سے زیادہ بولی جانے اور سمجھی جانے والی زبان ہے، لیکن کیا وجوہات ہیں کہ ہم اردو کی تعلیمی اہمیت کے بارے میں ہمیشہ سے ہی شش و پنج اور کنفیوژن کا شکار رہے ہیں۔ پچھلے دنوں وزیر اعلیٰ پنجاب عثمان بزدار نے اپنے ایک ٹویٹ کے توسط 2020ئ سے پرائمری ذریعہ تعلیم کو انگریزی سے اردو زبان میں کرنے کا اعلان کیا۔ عثمان بزدار کے بقول زیادہ تر اساتذہ کا قیمتی تدریسی وقت مضامین کا ترجمہ کرنے میں گزر جاتا تھا اور کنسیپٹ یا اسباق کے تصور کو سمجھانے کیلیئے وقت ہی نہیں مل پاتا

تھا۔ماہرین تعلیم کے نزدیک یہ ایک درست قدم ہے اور" دیر آید درست آ ید" کے مترادف ہے۔گزشتہ دور حکومت کے وزیر تعلیم رانا مشہود نے اس وقت کی تعلیمی پالیسی کے تحت تمام سرکاری سکولوں میں انگریزی زبان کولازمی ذریعہ تعلیم قرار دیا تھا۔جو کہ ایک غیر دانشمندانہ قدم تھا۔اس قدم سے جہاں سکولوں میں تعلیمی عمل سست ہوا وہاں اساتذہ کو پیشہ وارانہ ذمہ داریوں میں دوہرے پریشر کا سامنا کرنا پڑا۔

ردوزبان کی اہمیت اور ہماری ذمہ داری

متعلم امان اللہ باجوڑی

تہذیبی ورثہ اور قومی تشخص کا وجود کسی بھی قوم کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے،جو قوم اپنی تہذیب و تشخص کو بالائے طاق رکھ کر دوسری اقوام کی غلامی کے پھندوں کو گلے میں ڈال لیتی ہے،وہ درحقیقت اپنے حال و مستقبل کا رشتہ ماضی سے کاٹ دیتی ہے ،ایسا ماضی جس کی بنیادوں پر قوم وجود میں آئی تھی،جس کے نشیب و فراز سے نبرد آزما رہ کر پیش رووٗں نے اپنے ورثے کی حفاظت کی تھی۔

بلاشبہ زبان، لباس اور تاریخ کسی بھی قوم کی قومیت ،اجتماعیت اور تعمیر و ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے،اپنے طور طریقوں پر جب عار محسوس کی جانے لگے تب تعمیر و ترقی کے پیمانے بدل جاتے ہیں،لوگ اسلاف کے تعلیم و تہذیب کو فرسودہ کہہ کر ٹھکرادیتے ہیں۔ایسے لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ دنیاوالوں کا چاند پر قدم رکھ دینے کے بعد اپنے ماضی میں کھوئے رہنا قعرِ مذلت میں سرگرداں رہنے کے مترادف ہے،اس طرح جب تہذیب سے رابطہ منقطع ہوجائے تو ذلت و غلامی ان کا مقدر بن جاتی ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ اپنی معاشرت کی عمارت جن بنیادوں پر کھڑی کی جارہی ہے اس میں غلامی کی دیمک لگی ہوئی ہے۔

”زبان“تہذیب کا وہ حصہ ہے جو انسانی معاشرے کی بنیاد ہے،زبان معاشرے کے قیام کے لیے وہ خون ہے جس کے بغیر زندگی کی نبضیں سکڑ جاتی ہیں اور قومی و مادری زبان احوال کی نذر ہوجاتی ہے۔”اردو“ ہماری قومی زبان ہے،اردو میں ہمارا علمی ورثہ مرہون ہے،ہماری تہذیب و معاشرت کی تاریں اردوزبان سے جڑی ہوئی ہیں۔عربی زبان کے بعد شائد کسی زبان میں اتنا علمی ذخیرہ نہیں ہے جتنا اردو میں موجود ہے،اس وقت کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر اکابرین نے کوئی کتاب تصنیف نہ فرمائی ہو،یہ لاکھوں تصانیف اردو کی اہمیت و افادیت کو خوب واضح کرتی ہیں۔

ہندوستان میں اسلامی فوج کی درجنوں اقوام جب باہم گھل مل گئیں تو ایک نئی زبان اردو وجود میں آئی ،جس نے اپنی شیرینی کی بدولت تمام زبانوں پر گہرا اثر ڈالا۔اردو ایک خالص اسلامی زبان ہے اور مسلمانوں کا اس سے گہرا تعلق ہے،اس لیے فرنگ کا تازیانہ ہمیشہ سے اس پر برستا رہا ہے۔بنی اسرائیل کی نسل کشی کے لیے فرعون نے ان کی اولاد ذبح کروائی،کمال اتاترک نے ترکیوں کا رشتہ اسلامی تہذیب سے توڑنے کے لیے ترکی زبان کا رسم الخط تبدیل کیا اور ہماری اردو کو اردو باقی رکھ کر انگریزی کے اتنے الفاظ داخل کرائے گئے کہ سخت اندیشہ ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ابتدائی اردو ہی سے ناواقف ہوں گی،چہ جائے کہ وہ ابوالکلام آزاد اور سید ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں سے استفادہ کرسکیں۔

حکم ران طبقے کا اردو سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، اس لیے ان کو 1973 کے آئین سے مطلع کرنا بے کار ہے،ان کو یہ بتانا کہ ملائیشیا میں "ملائی" زبان غلط بولنے پر جرمانہ کیا جاتا ہے بے فائدہ ہے،کیوں کہ ان کی توکوشش رہتی ہے کہ کس طرح باقی ماندہ نصاب کو بھی انگلش میں منتقل کیا جائے۔اس لیے علماء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اردو کی حفاظت علوم کی حفاظت کی نیت سے کریں،اپنے علمی ورثے کے تحفظ کا سوال ہے،اردو کی ترویج وتنقیح کی ضرورت ہے،اگر علماء نے بھی اس طرف توجہ نہ دی تو ممکن ہے کل کو درسِ نظامی کی کتابیں اور اسلاف کی دیگر تصانیف قابل استفادہ نہ رہیں۔

ہمارے اکابر نے اردو میں بے شمار تصانیف لکھ کر اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے ادا کیا ہے،مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے لے کر مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تک ایک طویل سلسلہ ہے۔اس لیے ہمیں اپنی زبان سے رشتہ جوڑنا ہو گا اور یہ رشتہ صرف چند الفاظ لکھنے بولنے سے مضبوط نہیں ہو گا،بلکہ زبان میں مہارت حاصل کرنا بھی ضروری ہے،کیوں کہ اسی میں ہماری تہذیب و تعلیم کی بقا ہے اور اسی میں ہمارا تحفظ۔اگر آپ نے ابھی تک

اُردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں

شمع فروزاں : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ہندوستان میں آزادی سے پہلے ایک ایسی زبان بولی جاتی تھی جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا، اگر اس کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جاتا تو اس کا نام ہندی ہوتا اور اگر فارسی خط میں لکھا جاتا تو اس کا نام اُردو ہوتا؛ اسی لئے اُردو زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں اور ہندی میں سنسکرت کے؛ اسی لئے اس میں بہت سی اصطلاحات عربی و فارسی زبان کی بھی ہیں، جب ملک آزاد ہوا اور سرکاری زبان پر بحث ہوئی تو آدھے ارکان کی رائے تھی کہ ہندوستان کو سرکاری زبان بنائی جائے اور اسے دونوں رسم الخط میں لکھا جائے؛ لیکن غالباً ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند کے تائیدی ووٹ کی بناء پر اُردو کو اس حیثیت سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا؛ لیکن بعض اصطلاحات جو پہلے سے آرہی تھیں وہ بتدریج جاری ہیں؛ لیکن اب حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ان اصطلاحات کا استعمال بھی نہیں کیا جائے گا، یہ ایک المیہ ہے کہ جو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی، اسی کو دیس سے نکال دیا جارہا ہے، اور اس کو مسلمانوں کی طرف منسوب کرکے نفرت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ زبان کی حیثیت محض ایک ہتھیار اور ذریعہ کی ہے، وہ کسی خاص مذہب اور فکر کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ اظہار و تعبیر کا ایک ذریعہ ہوتی ہے، جس کے ذریعہ اچھی فکر کو بھی فروغ دیا جاسکتا ہے اور منفی اور نقصاندہ فکر کو بھی پروان چڑھایا جاسکتا ہے؛ اس لئے زبان کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ہاں بعض ایسی زبانیں ہیں جن میں کسی خاص مذہب کی بنیادی کتاب موجود ہے، اس پہلو سے اسے اس مذہب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس نسبت میں کوئی برائی نہیں، جیسے سنسکرت زبان ہندو مذہب کے لئے، فارسی پارسیوں کے لئے، عبرانی یہودیوں کے لئے اور عربی مسلمانوں کے لئے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں ، اردو زبان اس معنی میں کوئی مذہبی زبان نہیں، اس زبان کی تشکیل میں سب سے اہم کردار ہندی کا پھر فارسی کا ہے، زبان کی بنیاد اس کے گرامر اور قواعد پر ہوتی ہے، الفاظ اور تعبیرات تو ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، اردو قواعد اصل میں ہندی زبان سے ماخوذ ہیں، واحد و جمع، مذکر و موئنث کے صیغے، جملوں کی ترتیب وغیرہ

عام طور پر وہی ہیں جو ہندی کی ہیں، محاورے بھی زیادہ تر ہندی ہی کے اردو میں مستعمل ہیں، تشبیہات و استعارات میں غالباً فارسی نے زیادہ حصہ پایا ہے، ہندی کی سادگی اور فارسی کی مٹھاس کے ساتھ عربی الفاظ کی شمولیت نے اس کے شوکت وشکوہ میں اضافہ کیا ہے، اس کے علاوہ سنسکرت، انگریزی، پنجابی، دکنی اور سنسکرت زبانوں کے الفاظ کی آمیزش نے اس کو ایک گلدستہ سا بنا دیا ہے، جس میں ہر پھول کا رنگ جدا اور ہر غنچہ کی خوشبو ایک دوسرے سے سوا ہے، اس لئے اس کا نام ہی "اُردو" پڑ گیا؛ گویا یہ ایک زبان نہیں بلکہ زبانوں کا لشکر ہے، یہ گل نہیں بلکہ ہم رنگ پھولوں کا گلستاں ہے، اس حقیقت نے اس زبان کو بیک وقت مختلف زبانوں کی خوبیوں کا امین بنادیا ہے ۔

اسی لئے ہمیں اردو زبان کی خدمات میں شروع ہی سے غیر مسلم حضرات کا نمایاں کردار نظر آتا ہے، کسی زبان کو معیاری زبان کا مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے اپنے اصول و قواعد متعین ہو جائیں، گرامر کے بغیر زبان ایک عوامی بولی تو ہوتی ہے، ایسی زبان نہیں ہوتی جس میں معیاری اور ادبی، علمی اور تحقیقی لٹریچر تیار ہو سکے، اس کے قواعد مرتب کرنے والوں میں سب سے ابتدا میں جن لوگوں کا نام ملتا ہے، وہ بقول بابائے اردو مولوی عبد الحق کے تین شخص ہیں: جان جو شوا کٹلر، مشنری شلز، ہیڈلے، (قواعد اردو، مقدمہ: ص:۱۵) اور یہ بات اہل علم کے لئے محتاج اظہار نہیں کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں 'فورٹ ولیم کالج' اردو زبان میں تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا اہم مرکز تھا، یہ تو انگریزوں کا ذکر تھا، اردو زبان میں ہندو بھائیوں کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان پر کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، جناب چکبست نسیم، کرشن چندر، پریم چند، آنند نرائن ملا شعراء اور ادباء ہیں جن کے بغیر اردو زبان کی تاریخ نامکمل اور ناتمام رہے گی، اردو کتابوں کی طباعت میں 'منشی نول کشور' کی جو خدمات ہیں، شاید ہی کوئی بڑا سے بڑا مسلمان ناشر بھی اس باب میں ان کی ہمسری کر سکے، انھوں نے فوٹو آفسیٹ پریس کے دور سے پہلے جس خوب صورت، روشن اور بڑی حد تک کتابت کی غلطیوں سے پاک و صاف اردو، فارسی اور عربی لٹریچر پیش کیا وہ کام نہیں کارنامہ ہے، اسی طرح اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی ترویج اور ان کے افکار و نظریات کو پیش کرنے میں بھی اردو کا بہت ہی نمایاں حصہ رہا ہے، اس

سلسلہ میں جناب محمد عزیر کی تالیف "اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ "(صفحات:۳۲۴، ناشر انجمن ترقی اردو) خاص طور پر لائق مطالعہ ہے ۔

تاہم یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر میں اپنا مذہبی لٹریچر زیادہ تر اردو زبان میں پیش کیا، محض اس وجہ سے اردو زبان کو ایک گروہی زبان کی حیثیت دے دی گئی اور یہ تاثر دیا گیا کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے؛ حالاں کہ اگر یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی تب بھی یہ ملک کی ایک ایسی اقلیت کی زبان قرار پاتی ہے جن کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق چودہ فیصد کے قریب ہے اور جن کی حقیقی تعداد پندرہ تا بیس فیصد بتائی جاتی ہے، جو زبان ملک میں اتنے بڑے گروہ کے لئے ذریعہ اظہار ہو، کیا اس کی اہمیت سے انکار کیا جاسکتا ہے ؟ اس کے لئے ضرورت ہے مخلصانہ جد وجہد، بے غرض کاوش اور اس تحریک کے لئے حکیمانہ قیادت کی، اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اردو زبان کے حقوق کے لئے جد وجہد کا نعرہ لگاتے ہیں، وہ خود اس میں غیر مخلص ہوتے ہیں، وہ اسے ایک سیاسی ایشو کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ خود اردو زبان سے ناواقف ہوتے ہیں، ان کے گھر میں اردو کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، وہ اس شور و ہنگامہ کو سیاسی مفادات کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں اور جہاں ان کی اقتدار اور پیسوں کی بھوک کم کرنے کے لئے ایک دو لقمے منہ میں ڈال دیئے جاتے ہیں زبان گنگ ہو جاتی ہے، سیاسی قائدین اردو کے دوسری سرکاری زبان ہونے کا اعلان تو کرتے ہیں، لیکن یہ سرکاری حکم فائلوں میں دفن رہتا ہے اور عملی طور پر اردو کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا ۔

آزادی کے بعد اگر سرکاری سطح پر اردو کی ترقی کے لئے کوئی کام ہوا ہے تو وہ 'انجمن ترقی اردو بورڈ' کا قیام اور اس کے تحت فنی، سائنسی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت اور 'مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' کا قیام ہے، ان دونوں اداروں نے علمی، تحقیقی اور تعلیمی اعتبار سے اردو کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے، اور ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، اردو ادب کو صرف لیلی مجنوں کی کہانیوں، شیریں و فرہاد کی داستانوں، اور جام وپیمانہ کی سرمستیوں سے ایک ایسی زبان نہیں بنایا جاسکتا جو علم و تحقیق کی ضرورت کو پورا کرتی ہو اور اپنے دور کے سماجی و معاشی مسائل اور اپنے عہد کے افکار و نظریات کی ترجمان بن سکتی ہو؛ اس لئے ہمیں

چاہیے کہ ہم زبان کی ترقی و تعمیر کے ایسے اداروں کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کا ایسا تعاون کریں کہ وہ ملک میں ایک با وقار ادارہ کی حیثیت سے جانے جائیں ۔

اُردو زبان سے متعلق دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس زبان میں جتنا کثیر اسلامی لٹریچر ہے، عربی زبان کے بعد دنیا کی کسی اور زبان میں اتنا بڑا اسلامی سرمایہ موجود نہیں، اُردو زبان میں متعدد ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ انھیں عربی کا جامہ پہنایا جارہا ہے اور وہ عرب علماء و محققین سے بھی داد و تحسین وصول کررہی ہیں، اس وقت دنیا میں مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ اپنی بول چال کے لئے اُردو کا گرویدہ ہے، صرف برصغیر میں تقریباً چالیس کروڑ مسلمانوں اردو بولتے اور سمجھتے ہیں، یورپ اور افریقہ کے مختلف ملکوں نیز امریکہ و کناڈا وغیرہ میں برصغیر کے تارکین وطن کی وجہ سے اُردو وہاں کی زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں سے ایک ہوگئی ہے، میں جب برطانیہ گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں سے پانچ اُردو روزنامے نکلتے ہیں، خلیجی ممالک سے دو کثیر الاشاعت اُردو روزنامے شائع ہو رہے ہیں، اس طرح اُردو ایک عالمی اور انٹرنیشنل زبان ہوگئی ہے ۔

اس وقت دنیا کے اکثر آزاد دینی مدارس میں اردو ہی ذریعہ تعلیم ہے، ہندو پاک میں تو ایسا ہونا باعث تعجب نہیں، لیکن امریکہ، یورپ اور افریقی ملکوں میں بھی آزاد دینی مدارس میں تدریس کی زبان اردو ہے، اس لئے مسلمانوں کے حق میں یقیناً اردو زبان کی اہمیت دوچند ہے، اُردو ان کے مذہبی اور تہذیبی ورثہ کی امین ہے، اُردو سے رشتہ کی استواری اپنی تاریخ، اپنے مذہب اور اپنی فکری اور تہذیبی روایات سے مربوط ہونا ہے، اردو زبان میں اسلامی اصطلاحات اور قرآنی تعبیرات ایسی رچ بس گئی ہیں جیسے گلاب میں اس کی سرخی اور موتیا میں اس کی خوشبو، یہاں تک کہ غیر مسلم ادباء بھی اپنی تحریروں میں بے تکلف "ماشاء اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ، نعوذ باللہ" وغیرہ الفاظ لکھتے ہیں اور ایسی تشبیہات سے کام لیتے ہیں جن کے پیچھے اسلامی فکر کارفرما ہوتی ہے ۔

اہل اُردو کو دینی مدارس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ معاشی مواقع سے رشتہ ٹوٹ جانے کے باوجود انھوں نے اس زبان کو زندہ رکھا ہے، اگر کوئی قوم اپنی زبان کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرلے اور اس کے لئے کسی قدر

قربانی دینے کے لئے تیار ہو تو کوئی طاقت اس سے اس کی زبان نہیں چھین سکتی، ہندی اور سنسکرت ایک ایسی زبان ہے جو کئی صدیوں سے حکمرانی سے محروم تھی اور سرکاری زبان فارسی تھی؛ لیکن اس زبان کے بولنے والوں نے اسے زندہ رکھا، عبرانی زبان ہزاروں سال سے کسی حکومت کی زبان نہیں رہی، نہ عام بول چال میں اس کا رواج رہا، لیکن یہودیوں نے زبان کو باقی رکھا اور اسرائیل بننے کے بعد اسے سرکاری حیثیت حاصل ہوئی، کیا مسلمان اپنی اس زبان کو جو ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہے، اپنی کوششوں سے باقی نہیں رکھ سکتے ؟ یقیناً باقی رکھ سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ اور مخلص ہوں، محض حکومتوں سے شکوہ اس مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا، جو قومیں زندہ، بالغ نظر، بیدار مغز اور حوصلہ مند ہوتی ہیں ، وہ اپنے مسائل خود حل کرتی ہیں اور اپنے آپ کو بیساکھیوں کا محتاج نہیں ہونے دیتیں۔

اس پس منظر میں اردو زبان کے بقا اور تحفظ کے سلسلے میں عام لوگ جو حصہ ادا کر سکتے ہیں، اس سے متعلق چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

☆ جو انگلش میڈیم اسکول مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں، ان میں خاص طور پر اردو زبان کے لئے دسویں کلاس یا کم سے کم ساتویں کلاس تک مستقل ایک گھنٹی رکھی جائے اور پوری توجہ کے ساتھ تعلیم دی جائے؛ کیوں کہ اب اردو میڈیم اسکول یا تو قائم نہیں ہو رہے ہیں، یا قائم ہو رہے ہیں تو انھیں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو پارہی ہے جو ہونی چاہیے؛ اس لئے اب انگلش میڈیم اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے نہ سہی تو کم سے کم بحیثیت زبان ہی اردو پڑھائی ضروری ہے۔

☆ معیاری اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور عام لوگوں کا ذہن بنایا جائے کہ وہ ایسے اسکولوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ان میں اپنے بچوں کو داخل کریں، جیسا کہ مہاراشٹر اور بعض دوسرے صوبوں میں اردو میڈیم اسکولوں کی بہت اچھی کارکردگی سامنے آرہی ہے۔

☆ زیادہ سے زیادہ اخبارات و رسائل خرید کئے جائے، اس وقت ہندوستان میں اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار "منصف" ہے جس کی اشاعت ساٹھ ہزار ہے، حیدرآباد کے تمام اردو اخبارات کی مجموعی اشاعت ایک لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہوگی، حالاں کہ حیدرآباد شہر، تلنگانہ اور کرناٹک و مہاراشٹر کے وہ

اضلاع جو دکن اسٹیٹ میں شامل تھے ، میں اردو قارئین کی تعداد ایک کروڑ سے کم نہ ہوگی ، صرف حیدرآباد میں مسلمانوں کی آبادی تیس لاکھ سے متجاوز ہے ، اگر پانچ فیصد اردو خواں حضرات بھی اردو اخبارات خرید کر پڑھنے کا مزاج بنالیں تو کم سے کم صرف حیدرآباد اور اس کے اطراف میں چھپنے والے اردو اخبارات کی تعداد اشاعت پانچ لاکھ سے بڑھ جائے گی ، یہ حال تو حیدرآباد کا ہے جہاں اخبار خرید کر پڑھنے کا ذوق نسبتاً بہتر ہے ، ملک کے دوسرے علاقوں میں تو اس سے بھی زیادہ افسوسناک صورت حال ہے ، اس لئے اردو قارئین کو چاہیے کہ وہ ایک مہم کے طور پر اردو اخبارات ورسائل کی ہمت افزائی کریں اور ہوٹل کی میز پر اخبار پڑھنے کے بجائے شخصی طور پر زیادہ سے زیادہ اخبارات خرید کریں ، ایک اخبار کی قیمت چائے کی ایک پیالی سے بھی کم ہوتی ہے ، اگر آپ نے دو تین اخبار خرید کئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے آج دو تین پیالی چائے کم پی ، لیکن اس سے آپ کی زبان کو جو تقویت پہونچے گی ، آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے ۔

☆ اُردو کتابوں کی فروخت بھی بڑی مشکل سے ہوتی ہے ، بعض کتابیں ایسی ہیں جو انگریزی یا عربی میں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں ، لیکن وہی جب اردو زبان کا پیکر اختیار کرتی ہیں ، تو ایک تو ہزار ، گیارہ سو نسخے چھپتے ہیں اور ان کے نکلنے میں بھی دس ، گیارہ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے ، اس لئے ہمیں اپنے گھروں میں اردو کتابیں پڑھنے اور انھیں خریدنے کا مزاج بنانا چاہیے ، اپنے دیوان خانوں کو مصنوعی پھولوں کے گلدستوں سے آراستہ کرنے کے بجائے کتابوں سے آراستہ کیجئے کہ یہ آپ کے اور آپ کی نسلوں کے لئے دل و دماغ کی غذا ہیں ، نیز اپنی آمدنی کا ایک حصہ ہر ماہ کتابوں کے خرید کرنے کے لئے مخصوص کرلیجئے ، اس طرح آپ اپنے ترکہ میں زر و زمین کے ساتھ ساتھ علم و دانش بھی چھوڑ کر جاسکیں گے ۔

☆ اردو میں خط وکتابت اور نجی یادداشتیں لکھنے کا مزاج بنایئے ، گھر میں اپنے بال بچوں سے اردو ہی میں گفتگو کا اہتمام کیجئے اور خاص کر اتوار کے دن کو اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانے کا دن بنایئے ، گھر میں اردو زبان کا یہ ماحول اردو کے تحفظ اور اس کے بقا کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو گا ۔

غرض کہ اردو زبان کے تحفظ میں ہمیں صرف سیاسی کوششوں پر قناعت نہیں کرنی چاہیے اور حکومتوں

سے مطالبات کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے؛ بلکہ خود اپنا حصہ بھی ادا کرنا چاہیے، خود بے عملی کا راستہ اختیار کر کے حکومت سے تحفظ کا مطالبہ کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص دوسروں سے اپنے گھر کی حفاظت کی امید رکھے اور خود ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے

اردو زبان کی چند خوبیاں

شمارہ نمبر 48 میں ہم نے لکھا تھا کہ بھارت میں شائع ہونے والے اردو اخبارات نے ہلاک سے مہلوک بنالیا ہے، یعنی ہلاک ہونے والا۔ اس پر احمد انی کالونی، میر پور خاص سے جناب باب الدین بھی شریکِ محفل ہوئے ہیں اور یہ باب باندھا ہے کہ ”ہلاک سے مہلوک غلط ہے، کیوں کہ ھَلَکَ، یَہلِکُ عربی میں فعل لازم ہے یعنی ہلاک ہونا۔ اب اس کا مفعول کیسے بن سکتا ہے۔ اس کا فاعل ہے ہالک، جس کے معنی ہوں گے ہلاک ہونے والا، جیسے راحل رحلت کرنے والا۔

بھائی باب الدین خوش آمدید۔ اچھا ہوا آپ نے وضاحت کر دی۔ لیکن بات تو بھارت سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی ہے، خاص طور پر حیدر آباد دکن کے اخبارات، جنھوں نے مہلوک کی جمع مہلوکین بھی بنالی ہے۔ اب اُن تک یہ بات پہنچا دی جائے تو امید نہیں ہے کہ اصلاح قبول کریں گے، کیونکہ عربی قواعد ایک طرف، ہالک کون لکھے گا۔ باب الدین، خط، کتابت کا باب کھلا ہی رکھیے گا، آپ سے کچھ سیکھنے کو ملے گا۔

اردو زبان دنیا کی واحد زبان ہے جس میں ہر تلفظ مل جاتا ہے۔ کسی زبان میں ٹ، پ، گ نہیں ہے تو کسی میں ڈ، ڑ اور گھ، بھ وغیرہ نہیں ہے۔ یہی نہیں، اس زبان کا ایک کمال یہ ہے کہ ہر رشتے کے لیے الگ لفظ، الگ پہچان۔ اور جانوروں کے بچوں تک کے لیے الگ الفاظ، کہ سنتے ہی پتا چل جائے کہ کس جانور کا ذکر ہے۔ عربی یقیناً بہت وسیع اور فصیح زبان ہے لیکن اس میں بھی رشتوں کے لیے الگ الگ الفاظ نہیں ہیں۔ مثلاً باپ کا ہر بھائی عم ہے، جب کہ اردو میں چچا، تایا ہیں۔ اور زیادہ ہوں تو بڑے تایا، بڑے ابو وغیرہ، ایسے ہی پھوپھی، چچی، خالو، ماموں وغیرہ۔

معروف صحافی آغا شورش کاشمیری مرحوم کی ایک پرانی تحریر ہے جس میں انہوں نے جانوروں کے بچوں کے لیے مختص الفاظ کی نشاندہی کی ہے مثلاً ”بکری کا بچہ: میمنا۔ بھیڑ کا بچہ: برّہ۔ ہاتھی کا بچہ: پاٹھا۔ اُلّو کا بچہ: پٹھا (لیکن پٹھا تو پہلوانوں کا بھی ہوتا ہے)۔ بلی کا بچہ: بلونگڑہ۔ گھوڑی کا بچہ بچھیرا۔ بھینس کا بچہ: کٹڑا۔ مرغی کا بچہ: چوزا۔ ہرن کا بچہ: برنوٹا۔ سانپ کا بچہ: سنپولا۔ سور کا بچہ: گھٹیا۔

یہ بڑی طویل فہرست ہے جس میں بعض جانداروں اور غیر جانداروں کی بھیڑ کے لیے خاص الفاظ مقرر ہیں۔ درج بالا ''بچوں'' میں ہاتھی اور ہرن کے بچے کے لیے آغا صاحب نے جو نام دیے ہیں وہ نامانوس سے ہیں یعنی پاٹھا اور برنوٹا۔ اس فہرست کا باقی حصہ پھر کبھی سہی۔

سہ ماہی بیلاگ کا اکتوبر تا دسمبر کا شمارہ ابھی ابھی ہاتھ لگا ہے۔ اس رسالے میں مدیر اعلیٰ عزیز جبران انصاری تلفظ کی اصلاح کرتے ہیں، اس لیے ہم بھی اپنی اصلاح کے لیے اسے توجہ سے پڑھتے ہیں۔ اس شمارے میں عزیز جبران نے توجہ دلائی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال غلط دیکھنے میں آرہا ہے ''جمع، طبع، سطح، سطر، منع، معنی''۔ ان الفاظ میں دوسرا حرف ساکن ہے مگر نوجوان بلکہ بعض کہنہ مشق شعرا کے کلام میں بھی یہ خامی موجود ہے۔ عزیز جبران نے درست تلفظ کے ساتھ اساتذہ کے اشعار بطور مثال پیش کیے ہیں۔ قارئین بھی اس سے استفادہ کریں۔

جمع (ج۔م۔ع میم ساکن ہے)

امیر جمع ہیں احباب حالِ دل کہہ لے

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

طبع کے لیے غالب کا شعر:

پاتے نہیں راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

اسی طرح دیگر الفاظ کے تلفظ کی سند میں اساتذہ کے شعر دیے گئے ہیں لیکن سطح کے لیے مرزا غالب کا جو شعر دیا گیا ہے اس میں سطح کا کوئی ذکر نہیں۔ شعر یہ ہے:

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی

بن گیا روئے آب پر کائی

ہمارا خیال ہے کہ دوسرا مصرع جناب انصاری کو صحیح یاد نہیں رہا، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے غالب کی اصلاح کر ڈالی ہے۔ دوسرے مصرع میں ''روئے آب'' کی جگہ سطح آب ہے جو شاید پانی کے نیچے چلا گیا۔

ایک ادبی رسالے 'انشا' میں ایک افسانہ ہے ''من کا چور''۔ اس میں ایک جملہ ہے ''اس نے پھیکے منہ سے بھی نہ پوچھا''۔ محاورے سے یہ چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں ہے۔ تو کیا پہلے منہ میٹھا کرتا پھر پوچھتا! اصل محاورہ ہے ''جھوٹے منہ بھی نہ پوچھنا''۔ اب اگر ادیب اور افسانہ نگار بھی غلط اردو لکھنے لگیں تو دوسروں سے کیا شکوہ۔ ہمارے صحافی بھائی تو ادیب نہ افسانہ نگار۔ لیکن صحافیوں نے شعر اور ادب کو ممنوع کیوں قرار دے رکھا ہے؟ اچھی نہ سہی، غلطی سے پاک اردو لکھنے کے لیے ادب کا تھوڑا بہت مطالعہ ضروری ہے۔ کوئی ایسا لفظ سامنے آئے جس کا مفہوم تو معلوم ہو لیکن لغوی معانی معلوم نہ ہوں تو فوراً لغت دیکھ لی جائے۔ ہم اب تک یہی کرتے ہیں، کہ ہر ایک تو بابائے اردو نہیں ہوتا۔ اور بابائے اردو بھی لغت ضرور دیکھتے ہوں گے۔

لاہور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ایک حدیث کا ترجمہ پڑھا کہ ''میںؑ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں''۔ مکارمِ اخلاق کا مطلب کیا ہے؟ وقت کے ساتھ اب کئی الفاظ مشکل ہوتے جارہے ہیں۔ مکارم اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ یہ مکرمت کی جمع ہے، اور مکرمت کا مطلب ہے بزرگی، مہربانی، عنایت، نوازش، عظمت وغیرہ۔ چنانچہ مکارم اخلاق کا مطلب ہوا: اخلاق کی عظمت، بزرگی۔ اسی سے مکّرم ہے جس سے آپ بھی واقف ہیں۔ مکرم (عربی۔ صفت) عزت دیا گیا، بزرگ، محترم، معظم، معزز وغیرہ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مطلب ہے کہ وہ اخلاقِ کریمہ کی تکمیل کے لیے بھیجے گئے۔ اور آپؐ سے بڑھ کر اخلاق کس کا ہوسکتا ہے۔ اب کوئی مکرم، محترم اخلاق کے مطلب نہ پوچھ بیٹھیں۔ اخلاق میں الف پر زبر ہے۔ مکارم بفتح اول وکسر چہارم یعنی مَکارِم۔ فی الوقت اتنا ہی، ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔

اُردو زبان کے فروغ کی اہمیت!

کسی بھی ملک کی قومی زبان اُس کی پہچان ہوتی ہے اور اُس کی ترقی کے لئے بہت ضرور ہوتی ہے، ہر ملک کی قومی زبان اُس ملک کے معاشرتی تہذیبی اور ثقافتی اقتدار کے بارے میں بتاتی ہے اور یہ قومی زبان ہی ہے جو ملک کے تمام لوگوں کو آپس میں جوڑے رکھتی ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے اس کو لشکری زبان بھی بولا جاتا ہے۔ جب مسلمان ہجرت کر کے ہندوستان آئے تو اُن کی زبان عربی اور فارسی تھی، لہٰذا وہ بات چیت میں زیادہ تر اپنی زبان ہی کا استعمال کرتے تھے، کیونکہ وہ پوری طرح مقامی زبان سے واقف نہیں تھے، اِس لئے اظہارِ مقصد کے لئے مختلف زبانوں کے الفاظ استعمال کرتے اور اِسی طرح اُردو زبان کا آغاز ہوا۔ اُردو زبان در حقیقت مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے اور یہی وجہ بھی ہے کہ اس میں اکثر اوقات عربی اور فارسی کے لفظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یوں تو پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، جیسے کہ پنجابی، سندھی، پشتو، لیکن پاکستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اُردو ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس ملک میں اُس کی قومی زبان کو اہمیت دی جائے، جتنے بھی ترقی یافتہ ممالک ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنی زبان میں ہی ترقی کی ہے۔ اگر ہم بات کریں امریکہ کی تو آج انہوں نے اپنی زبان کے ذریعے دُنیا بھر میں قبضہ کیا ہوا ہے اور آج کل کے زمانے میں انگریزی زبان سیکھنا اور بولنا ہر شخص کی ضرورت نہیں، بلکہ مجبوری بن گئی ہے۔ ہماری قوم کی بدقسمتی یہ ہے کہ بہت عرصے سے ہماری قومی زبان زوال کا شکار ہے اور اب ہم انگریزی زبان کو اُردو پر فوقیت دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو شخص انگریزی بول سکتا ہے صرف وہ ہی پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہے اور اب تو عالم یہ ہے کہ آج کل کی نوجوان نسل اُردو بولنے کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔ ہماری زبان اُردو جس کے فروغ کے لئے سر سید احمد خان نے دن رات محنت کی اور جس زبان نے ہمیں مرزا غالب اور علامہ اقبالؒ جیسے عظیم شاعر دیئے وہ ہی زبان آج اپنی اہمیت کھوتی جا رہی ہے۔ ہر ملک میں اُس کی قومی زبان کو سرکاری اہمیت حاصل ہوتی ہے اور تمام دفاتر، عدالتوں، سکولوں اور اسمبلیوں میں قومی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ ملک میں قومی زبان کو فروغ ملے اور ہر شخص قومی زبان سے واقف ہو جائے، لیکن پاکستان میں اُلٹی ہی گنگا بہہ رہی

ہے۔1973ء کی قرارداد میں اُردو کو قومی زبان قرار دیا گیا اور اُسے سرکاری زبان بنانے کی بھی سفارش کی گئی، لیکن افسوس آج تک پاکستان میں انگریزی کو ہی سرکاری زبان کی اہمیت حاصل ہے اور تمام تر نصاب اور سرکاری ریکارڈ بھی انگریزی میں ہی موجود ہے۔اس بات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آج تک ہماری سوچ انگریزوں کی ہی غلامی کر رہی ہے اور انہوں نے آج بھی اپنی زبان کے ذریعے ہمیں اپنا غلام بنایا ہوا ہے۔ پاکستان کو آزاد ہوئے 72 سال مکمل ہو چکے ہیں، لیکن آج تک کوئی بھی حکومت اُردو کو مکمل طور پر سرکاری زبان کی اہمیت نہیں دِلا سکی، ہر آنے والی حکومت یہ وعدہ تو ضرور کرتی ہے کہ اُردو کو فروغ دیا جائے گا، لیکن یہ وعدہ کبھی بھی اپنی پائے تکمیل کو نہ پہنچا۔ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ آج تک سندھ اور خیبر پختونخوا کی اسمبلی میں سیاست دان حلف بھی اپنی علاقائی زبان پشتو اور سندھی میں اٹھاتے رہے ہیں، لیکن اُردو کے زوال کی وجہ صرف اور صرف ہمارے حکمران نہیں، بلکہ پاکستان کا ہر ایک شخص ہے۔ آج ہر والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے بچے انگریزی میڈیم سکول سے ہی تعلیم حاصل کریں اور اور اُنہیں اُردو آئے نہ آئے، لیکن انگریزی ضرور بولنی آتی ہو، کیونکہ ہمارے ہاں جو شخص ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتا ہے اُس کا تو نا ہی کوئی شخص مذاق اڑاتا ہے اور نا ہی اُسے کوئی شخص جاہل سمجھتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص کبھی انگریزی کا کوئی جملہ غلط بول جائے تو محفل میں موجود تمام لوگ ہی اُسے جاہل قرار دے دیتے ہیں۔پاکستان میں کسی شخص کی اہلیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ وہ انگریزی کس قدر عمدہ بولتا ہے اور اُسی شخص کو قابل بھی سمجھا جاتا ہے اور اُسے اُردو بولنے والوں پر فوقیت بھی دی جاتی ہے۔ آج تمام تر دفاتر میں بھی صرف انگریزی زبان بولنے والوں کا ہی راج ہے کسی بھی ایسے شخص کو قطعاً نوکری پر نہیں رکھا جاتا، جس کی انگریزی کمزور ہو یہ ہی وجوہات ہیں کے روز بروز اُردو زبان زوال کا شکار ہوتی جارہی ہے، اور اُسے وہ مقام نہیں مل پارہا، جس کی وہ مستحق ہے۔ہمارے ملک کے معاشی حالات خراب ہونے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج بھی انگریز ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ اگر کسی بھی قوم کی زبان کو اُن سے چھین لیا جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ قوم بھی تباہ ہو جاتی ہے اور ہمارے ساتھ بھی کچھ یوں ہوا ہے۔ ہم اپنی شناخت کھو بیٹھے ہیں اور اب ہم ایک دھندلی سی

شناخت لئے بس انگریزوں کی پیروی کرنے میں مگن ہیں اور یہ ہی وجہ ہے اب دُنیا میں ہماری کوئی پہچان نہیں، لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے ابھی بھی اگر ہم اِس بات کا احساس خود کو دلائے گے کہ ہماری قومی زبان ایک نہایت ہی خوبصورت زبان اور اگر ہم چاہیں تو اس زبان کی خوبصورتی اور مقام اس کو واپس لوٹا یا جاسکتا ہے تو پاکستان پھر سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی قومی زبان کو فروغ دیں تا کہ یہ زبان زندہ رہ سکے۔انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی ہرج نہیں، لیکن ہمیں اپنی قومی زبان بولنے اور سیکھنے میں بھی عار محسوس نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ در حقیقت یہ زبان ہی ہر پاکستانی کا اصل اثاثہ ہے۔

قومی زبان: اہمیت اور حقیقتِ حال

دنیا میں کوئی قوم اپنی زبان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ ہماری قومی زبان اردو ہے۔ قومی زبان سے مراد زبان جو سارے ملک کو اتحاد کے بندھن میں باندھے رکھتی ہے۔ ایک دوسرے کے عقائد، نظریات اور خیالات کو سمجھنے میں معاون و مددگار ہوتی اور تعلیم کی اساس مضبوط کرتی ہے۔ اس لحاظ سے قومی یکجہتی میں انتہائی نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی اس بات کا فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ خالقِ پاکستان اسمبلی نے اس حوالے سے فروری 1948ء میں یہ قانون پاس کر لیا تھا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اردو کی قومی زبان کی حیثیت کا اعلان بھی کر دیا اور قائد کے اعلان کے بعد کسی پس و پیش کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی لیکن بعد ازاں پاکستان مخالف لابی کے پھیلائے ہوئے پراپیگنڈے کے زیر اثر اور دیگر سیاسی وجوہات کی بناء پر زبان کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا رہا۔ لیکن 1973ء کے متفقہ آئین میں اس کی قومی اور سرکاری حیثیت کا تعین کر دیا گیا۔ چنانچہ آئین کی دفعہ 251 کا درجِ ذیل متن اس صورتحال کو مکمل طور پر واضح کر دیتا ہے۔ دفعہ 251(i) پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی اور یومِ آغاز سے 15 سال کے اندر اندر اس کے بطور سرکاری زبان اور دیگر اغراض سے استعمال کئے جانے کے انتظامات کئے جائیں گے۔

(ii)شق (i) کے تابع انگریزی کو سرکاری اغراض سے استعمال کیا جائیگا۔ جب تک اسے اردو سے تبدیل کئے جانے کے انتظام نہیں کر لئے جاتے۔

(iii)قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کئے بغیر کوئی صوبائی اسمبلی قانون کے ذریعے قومی زبان کے علاوہ کسی صوبائی زبان کی تعلیم، ترقی اور اس کے استعمال کے لئے اقدامات کر سکے گی۔

دستورِ پاکستان میں انگریزی زبان کو وقتی ضرورت کے تحت 13 اگست 1988ء تک کے لئے اردو کی جگہ عارضی طور پر زبان کی حیثیت دی گئی تھی اور 14 اگست 1988ء سے اردو کو اپنا مقام اور مرتبہ حاصل ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس حوالے سے آئین میں دیئے گئے پندرہ سال تو ایک طرف آج تک کوئی سنجیدہ حکومتی کوشش نظر نہیں آتی اور اس طرح آئین کی مستقل خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ ملک میں انگریزی کی بالادستی ہے اور اس کی بین الاقوامی حیثیت کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرکے اپنی زبان سے بیوفائی کی جارہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ آزاد ہونے کے باوجود بھی ذہنی طور پر غلامی کا ہی شکار ہیں۔ زبان اخلاق اور کردار پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہے۔ موجودہ دہشت گردی کی خوفناک صورتحال میں لطافتِ انسانی کو زندہ کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے جو اپنی زبان اردو کو قومی زبان کا درجہ دیکر پوری کی جاسکتی ہے۔

اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے کے اس اہم ترین معاملے کے ساتھ ساتھ ایک اور مسئلہ ہے جو اپنی زبان سے محبت کرنے والوں کے لئے مزید تکلیف کا باعث ہے۔ یہ معاملہ ہے الیکٹرانک میڈیا اور معاشرے کے انگریزی زدہ طبقے کی طرف سے اردو زبان کو بگاڑ کر بولنے کا۔ اردو ایک جامع زبان ہے اور یہ ہر قسم کے انسانی تاثرات کو الفاظ دینے پر قادر ہے۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا اور معاشرے کے ایک طبقے میں اس کو اس قسم کے مصنوعی انداز میں بولا جاتا ہے کہ سننے والے کو شرمندگی ہوتی ہے۔ جب تک ٹیلیویژن صرف پی ٹی وی تک محدود تھا اس میں زبان کی درست ادائیگی پر بہت زور دیا جاتا تھا اس سلسلے میں ٹیلیویژن کے ابتدائی بیس پچیس سال کے پروگرام اور نشریات بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہترین اردو سیکھنے اور بولنے والے ٹی وی کے لئے لکھتے اور کام کرتے تھے۔ الفاظ کا چناؤ بہترین ہوتا تھا اور ان کی ادائیگی اور صوتی تاثرات پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ناظرین کے اعلیٰ ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی ہوتی تھی۔ لوگ خبریں سنتے تھے، ڈرامے اور مذاکرے دیکھتے تھے اور اسی میڈیا سے انہیں بہترین شاعری اور موسیقی سننے کو ملتی تھی۔

آج جبکہ الیکٹرانک میڈیا بہت ترقی کر چکا ہے، بذریعہ کیبل وغیرہ بے شمار چینلز دیکھے جاسکتے ہیں۔ نجی سطح پر بہت سے ٹیلیویژن چینلز کام کر رہے ہیں، اردو زبان کی ادائیگی کی صورتِ حال نہایت مضحکہ خیز ہے۔ چند چینلز تو نجانے کس ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں کہ ان کے بیشتر پروگرام مقبولیت سے عاری ہیں۔ اس وقت زیر بحث چونکہ زبان کا مسئلہ ہے اس لئے اس موضوع پر ہی گفتگو کی جاتی ہے۔ ان چینلز پر اردو زبان میں بہتات کے ساتھ انگریزی الفاظ شامل کر کے بولے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خبریں پڑھنے والے اور پروگرام کے کمپیئر خواتین و حضرات قومی زبان میں انگریزی سمیت دیگر غیر ملکی زبانوں کے الفاظ شامل کر کے نہایت مضحکہ انداز میں بولتے ہیں اور اپنے چہرے کے تاثرات بھی ایسے بنا لیتے ہیں جیسے وہ غیر ملکی چینلز کے لوگوں کو کرتا دیکھتے ہیں۔ اسی طرح دیکھا جائے تو معاشرے میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو اپنی زبان میں بات کرنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ یہ لوگ یا تو مکمل طور پر غیر ملکی زبان بولتے ہیں یا اردو میں انگریزی کے الفاظ کثرت سے شامل کر کے گفتگو کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں میں ایک محدود طبقہ ایسا ہے جو نفسیاتی طور پر اُلجھا ہوا ہے۔ ان لوگوں کی اپنی اپنی ترجیحات ہیں جو زیادہ تر مادیت پر مبنی ہیں جو ان کو اپنی روایات سے بیگانہ کرنے کا باعث بن رہی ہیں اور غیر ملکی زبان میں بات کرنا ان لوگوں کے لئے بڑائی کی علامت ہے۔

قومی زبان کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے انگریزی کی بین الاقوامی اہمیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو قومیں اپنی زبان لکھتی اور بولتی ہیں اور انگریزی غلبے کا شکار نہیں، کیا وہ ترقی نہیں کر رہی اور دنیا میں اپنا وجود نہیں منوا رہیں؟ اس سلسلے میں چین، جاپان، جرمنی اور سیکنڈ نیوین ممالک شامل ہیں جہاں لوگ انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنی قومی زبان پر انحصار کرتے ہیں۔ ویسے اس وقت دنیا میں کم و بیش ڈیڑھ ارب افراد اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اردو ہمارے سارے صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ انگریزی زدہ حکمران طبقے، نام نہاد اشرافیہ اور خصوصاً بیوروکریسی اردو زبان کو اس کا مقام دلانے میں حائل ہیں۔ یہ طبقات اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پہلے لکھا جا چکا چونکہ ان طبقات کی معاشرے پر گرفت بہت مضبوط ہے اور جمہوریت ہونے کے باوجود عوام الناس کی پسند اور رائے ثانوی حیثیت رکھتی ہے اس لئے دیگر اور بہت سے معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کا غلبہ بھی قائم ہے اور آئینِ پاکستان میں دی گئی مہلت سے ستائیس سال مزید گزر جانے کے بعد بھی انگریزی زبان کا غلبہ قائم ہے۔ قومی زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے اس زبان سے محبت کرنے والے بہت سے لوگ انفرادی و اجتماعی سطح پر کوششیں کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ والدِ گرامی پروفیسر حمید کوثر (مرحوم) ان لوگوں کی اولین صف میں شامل تھے جو اردو زبان کو اس کا قانونی اور آئینی مقام دلانے کے لئے سرگرم تھے۔ اردو زبان سے محبت ان کے ایک ایک فقرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ انہوں نے نفاذِ اردو کے لئے قانونی جنگ بھی لڑی اور عدالتِ عالیہ کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔ آجکل پاکستان قومی زبان تحریک اردو کو اس کا قومی اور آئینی مقام دلانے کے لئے بھرپور جہد وجہد کر رہی ہے اور ہر شعبہ زندگی کے لوگوں میں اس حوالے سے آگاہی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ قانونی جدوجہد کی بھی بھرپور تیاریوں میں ہے۔ تحریک کی بھرپور کوششوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان اور اس کے اساسی نظریے سے محبت کرنے والے ہر فرد کو پاکستان قومی زبان تحریک کی کوششوں کی بھرپور حمایت اور مدد کرنی چاہیے، تاکہ اس کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوں اور بالآخر حکمران آئین کی دفعہ 251 کو اسکی روح کے مطابق نافذ کرنے پر مجبور ہو جائیں اور عوام کی خواہش اور قائد اعظمؒ کے حکم کی تعمیل ہو سکے۔

قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار

ڈاکٹر　　　محمد　　　ناظم　　　علی

زبان اظہار خیال اور مواصلات کا بہترین اور عمدہ ذریعہ ہے، یہ ایک سماجی ضرورت ہے۔ زبان کی بنیاد پر

ہی ہم حیوانی اور انسانی سماج میں امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات زبان کی بنیاد پر کہلاتا ہے۔ زبان خود اور خدا شناسی کا بہترین وسیلہ ہے۔ زبان نہیں تو ذہن نہیں اور جب ذہن نہیں تو زندگی نہیں۔ ملک و قوم کی ترقی کا دارومدار زبانوں پر ہے۔ زبان سماج اور معاشرہ کی ہمہ قسم کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ معاشرہ و سماج کی تعمیر و تشکیل میں مبان کا اہم رول ہوتا ہے۔ قوم کی ذہنی تعمیر و ترقی زبانوں کا کلیدی رول ہوتا ہے۔ زبان تہذیب و ثقافت کی محافظ ہوتی ہے اور انسانی قدروں اور انسانیت کو فروغ عطا کرتی ہے۔ زبانوں میں ملک و قوم کا اثاثہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ زبان تہذیب ہے تمدن کا اظہار ہے، قوموں اور ملکوں کو آپس میں متحد اور متفق رکھتی ہے۔ زبان ہی سے ملک پر حکومت کر سکتے ہیں۔ زبان شیریں تو ملک گریں۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب تہذیب و زبانوں کے ماننے والے رہتے بستے ہیں، یہ ملک ہمہ لسانی، ہمہ مذہبی، ہمہ تہذیبی ملک ہے یہاں بھانت بھانت کے لوگ آباد ہیں، ان کی تہذیب و مذاہب الگ الگ ہیں، کثرت میں وحدت یہاں کا شعار شیوہ ہے۔ بقائے باہم اس ملک کی خصوصیات ہے جیو اور جینے دو۔ بردباری، شانتی، امن، مشترکہ قدریں، گنگا جمنی تہذیب اس ملک کا وصف ہے، آن بان شان ہے۔ ہندوستان برسوں سے ان قدروں کا امین و نقیب رہا ہے اور آج بھی ہے اس کی طبیعت اور سرشت میں رواداری، قومیت، قومی آہنگی پوشیدہ ہے، قومی یکجہتی یہاں کا اولین وصف ہے۔ قومی یکجہتی ایسی طاقت ہے کہ جس میں ہمہ قسم کی ترقی مضمر و پوشیدہ ہے۔ یہ ایسی طاقت ہے جس سے ملک و قوم کا نام روشن ہوتا ہے اور پورے عالم میں ہماری شناخت بنتی ہے۔ بغیر قومی یکجہتی کے ملک و قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کی سلامتی اس بات میں مضمر ہیکہ یہاں قومی یکجہتی برسوں سے قائم و دائم ہے اور اس جذبے کے تحت ہمارا سماج و معاشرہ ترقی حاصل کر رہا ہے۔ اس ملک کی مثال ملنا دنیا میں مشکل ہے، یہ ایسا ملک ہے جہاں پر ہمہ اقسام کے لوگ رہتے ہیں، یہ ایک گلدستہ کے مانند ہے جس میں ہر قسم کے پھول موجود ہیں۔ گلدستہ کی خوبصورتی جب تک قائم رہے گی تب تک کہ اس کے ہر پھول کی نگہداشت ہو۔ ہر قوم کو ترقی کا حق حاصل ہے، وہ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندوستان ہندو، مسلم،

سکھ، عیسائیوں کا ملک ہے۔ سب اس کی ترقی کے خواہشمند ہیں۔ گوتم بدھ سے لے کر آج اس ملک میں مشترکہ قدریں ترقی حاصل کر رہی ہیں۔

قومی زبان اور تہذیب و ثقافت کی اہمیت

کریم بلوچ |

وقتِ اشاعت: February 22 – 2020

قومی ثقافت کی تشکیل میں ادیب و شاعر سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں، قومی احساس کو ابھارنے اور قومی شعور کو بیدار کرنے کی غرض سے یہ تمام لوگ گیتوں، قصوں، کہانیوں اور دیومالاہی تصورات کو تحریر میں لاتے ہیں، اس کے ساتھ ہی ان کی تخلیقات زبان و ادب کو ذرخیز کرتے ہیں۔ زبان کسی معاشرہ کی ذہنی ترقی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لیے جب تک زبان میں علمی و ادبی و فلسفیانہ موضوعات نہیں آئیں گے اس وقت تک معاشرہ کا ذہنی شعور محدود رہیگا اور جب مقامی زبان میں ادب پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی زبان کے معیار کے لیے قوانین و قواعد مرتب کیے جاتے ہیں اور لسانیات کے شعبہ میں ترقی ہوتی ہے۔

نئ لغات اور قواعد کی کتابیں لکھی جاتی ہیں محاوروں کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ تحریک بھی چلتی ہے کہ زبان کو کس طرح سے غیر ملکی عناصر سے پاک کیا جائے اور اس میں خالص قومی زبان کے الفاظ و محاورے جو ماضی میں استعمال ہوتے تھے اور پھر متروک ہوگئے تھے انہیں دوبارہ سے استعمال کیا جائے۔ اور قومی زبان کو ذرخیز بنانے کے لیے دوسرے زبانوں کی علمی و ادبی کتابوں کے ترجمے کیے جاتے ہیں تاکہ زبان میں اتنی وسعت پیدا ہو کہ اس میں مشکل مضامین کی تشریح کی جاسکے۔ یہ قومی زبان اور اس میں لکھا ہوا ادب مختلف جماعتوں، گروہوں اور علاقے کے لوگوں کو آپس میں متحد کرتا ہے۔

جدید قوم پرستی کی ترقی اور نشو نما کیلیئے زبان سمیت تہذیب و ثقافت اور ادب نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے جب لوگوں کی تہذیب و ثقافت مشترک ہوتی ہے تو ان کے درمیان ابلاغی رابطہ نہایت آسانی کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خیالات اور احساسات سے بخوبی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے درمیان ایک مشترکہ شعور و ادراک پیدا ہو جاتا ہے جو انکے نظریہ قوم پرستی کی بنیاد ہے مزید بر آں،

مشترکہ تہذیب و ثقافت کے باعث ایک مشترکہ زبان و ادب جنم لیتا ہے زبان و ادب جدید قوم پرستی کے ستون ہیں۔ تہذیب و ثقافت (زبان و ادب) نے بلوچ قوم پرستی کے فروغ میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔

بلوچ بحیثیت قوم ایک شاندار تاریخ اور ماضی کا مالک ہے جو اس وقت دنیا بھر میں مختلف ممالک میں آباد ہے اور اپنے قومی تشخص و زبان اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے ایک منفرد حیثیت اور مقام رکھتا ہے مگر تاریخ کے جبر کے باعث بلوچ اس وقت ایران افغانستان اور پاکستان اور دیگر علاقوں میں منقسم ہیں بلوچوں کی بنیادی زبان بلوچی کے علاوہ بھی دیگر زبانیں وجود رکھتی ہیں جو بلوچستان کے نسلی علاقائی سرحدوں میں بولی جاتی ہیں جیسے براہوئی۔ سرائیکی، دھواری اور ایرانی بلوچی بولتے ہیں۔ بلوچی زبان کی ایک مختلف تاریخی پس منظر ہے اور اس کی کسی بھی دوسرے زبان سے کوئی مشابہت یا تعلق نہیں جس کی خصوصیات کچھ منفرد اور ممتاز ہیں۔

سیاسی اعتبار سے زبان کی جدوجہد کے حوالے سے اگر دیکھا جائے اپریل 1946 میں ریاست قلات کے نیشنل پارٹی کی جنرل سیکریٹری میر گل خان نے ایک مضمون شائع کیا جس میں بلوچستان کی قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے بلوچی زبان کی حمایت کی گئی اور اسی طرح محمد حسین عنقا نے بلوچی زبان کی عنوان سے اداریہ تحریر کیا اور خان قلات سے مطالبہ کیا کہ بلوچی زبان کو اسکولوں میں تدریسی زبان کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے۔ اور بعد میں اسی لیے جنوری 1947 میں محمد حسین عنقا نے "بلوچ مجلس" کی بنیاد رکھی جس کا مقصد بلوچی زبان و ادب کا فروغ تھا۔

اور ان اکابرین کے علاوہ زبان کی ترجیحات کے حوالے سے نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کے بلوچستان میں دورِ اقتدار میں ایک کوشش کی گئی اور اس کے بعد حکمرانی کی ایک طویل عرصے گزرنے کے بعد نیشنل پارٹی کی حکومت میں ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ جب بلوچستان کے وزیر اعلیٰ تھے تو انہوں نے زبان و ثقافت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے حکومتی ترجیحات میں شامل کیا اور بلوچستان کے تمام زبانوں کے شعراء، ادباء اور گلوکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات اٹھائے جو ایک طرح سے خوش آئند عمل تھا اور دوسری طرف تمام مادری زبانوں کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کے لئے قرارداد منظور کی گئی۔

مگر مادری زبانوں میں تدریس کا عمل سست روی کا شکار ہے اب اس حوالے سے موجودہ حکومت اور اپوزیشن کو کام کرنا چاہیے، بلوچستان کے تمام مادری زبانوں کو درسی و تدریسی نصاب میں شامل کرے تاکہ تمام زبانوں کو عملی طور پر فروغ مل سکے۔ دوسری جانب بلوچ نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی زبان، تہذیب و ثقافت اور ادب کی نگہبانی کا فریضہ سرانجام دیں اور اپنے زبان اور قومی تشخص کی حفاظت کریں نہ کہ زبان، نسل، قبیلہ پرستی اور علاقہ پرستی کی بنیاد پر خود کو تقسیم کریں۔ بلوچ بحیثیت قوم خود کو مضبوط اور منظم کریں مستقبل کے تمام تر چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے تعلیم اور قلم کو اپنا ہتھیار بنائیں۔

ختم شد

معزز ممبرز!!!! یہ تمام مضامین انٹرنیٹ سے آپ کی سہولت کے لئے نیک نیتی سے یکجا کئے گئے ہیں تاکہ آپ کی امتحانی ضروریات پوری ہو سکیں۔ لہذا اگر آپ کو پسند آئیں یا آپ کے کام آئیں تو ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا۔ اور اگر بے کار لگیں اور نہ پسند آئیں تو ہمارا کوئی قصور نہیں جنہوں نے لکھے ہیں انہیں ہی برا بھلا کہیئے گا 🤣🤣😃😃😃😃 شکریہ